یادیں بُھٹو کی!

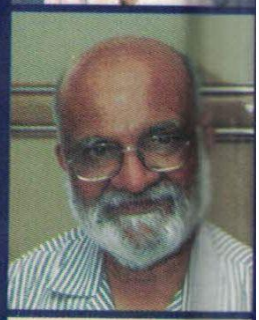

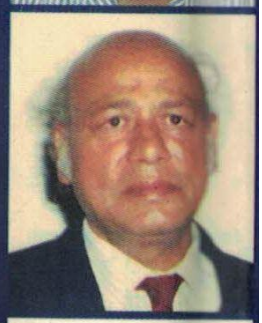

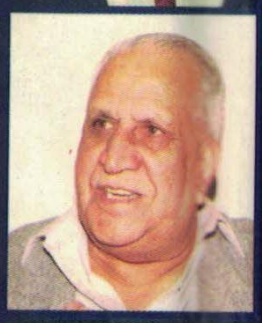

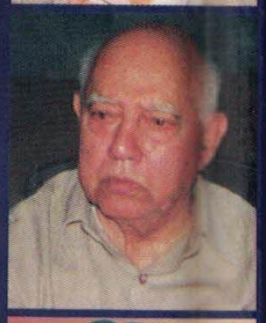

خورشید جونیجو

یادیں بھٹوکی!

خورشید جونیجو

احمد پبلی کیشنز۔ لاہور

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ©

اس کتاب سے مواد نقل کرتے ہوئے،
کتاب، مصنف اور پبلشر کا حوالہ دینا آپ کا اخلاقی فرض ہے!

اشاعت اوّل	اپریل 2008ء
ٹائٹل ڈیزائن:	محمد ذیشان مظہر
پرنٹر:	حاجی حنیف پرنٹرز
قیمت:	[redacted]

AHMAD PUBLICATIONS

2nd Floor, Malik Building # 1, Opp. PTV,
19-A, Abbot Road, Lahore-Pakistan
Ph: 042 6307828 Fax: 042 6314383
E-mail: ghalibooks@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحيم

اپریل1979ء - اپریل2008ء

29ویں برسی کے موقع پر بھٹو صاحب کی یاد میں
یہ کتاب شائع کی گئی۔

اپنے عدالتی قتل کے 29 سال بعد
وہ لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے۔

جب جب، جہاں جہاں
پاکستان کی تاریخ وسیاست کا تذکرہ ہوگا

''یادیں بھٹو کی''

زندہ رہیں گی۔

یہ کتاب پاکستان کے عوام کی نذر ہے
جو شہید بھٹو کی طاقت کا سرچشمہ ہیں

www.bhutto.org

فہرست

پیش لفظ	محترمہ بے نظیر بھٹو	9
اعتراف	خورشید جونیجو	13
قائداعظم کے نام خط	ذوالفقار علی بھٹو	15
وہ محبت کرنے والے شوہر تھے	بیگم نصرت بھٹو	17
ہمیشہ خوش باش	امیر بیگم	33
بہن کی زبانی	مسز منور الاسلام	41
میرے پیارے چچا	شبنم بھٹو	49
لاکھوں کا محبوب	طارق اسلام	55
ابتدائی دور	عمر قریشی	71
بااصول قانون دان	جی ایچ عباسی	75
عوامی رابطہ	حاجی نذر محمد لغاری	83
فرض کی راہ میں	محمد عرس	89

www.bhutto.org

گھر پیارا گھر	عثمان فلیش مین	95
میرا صاحب	عبدالقیوم خان	103
آپ بیتی	دوست محمد	109
میرا قائد	محمد حنیف خاں	117
بھٹو بطور وزیراعظم	میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیراللہ خان بابر	127
بھٹو بطور مصلح	شیخ محمد رشید	139
غریب کے گھروں کا کیس	غیاث الدین جانباز	167
شہید ذوالفقار علی بھٹو سے میری پہلی ملاقات	شیخ رفیق احمد	177
کام اور صرف کام	ایف کے بندیال	179
اک نعرہ بنا ہے اس کا لہو	حبیب جالب	187
نو پالیٹکس	ڈاکٹر کامل راجہ	191
میرے پاکستان	سعید ہمایوں ایڈووکیٹ	203
ایک نمونہ کار کی نظر میں	کرٹاہل فرام	209
نیکی کا پھل	منشی محمد حسین بھٹو	211
زمین تقسیم کر دی	الن نریجو	212
کھلے دروازے	عبدالواحد سومرو	213
بروقت امداد	غلام مصطفیٰ عمرانی	214
ایفائے وعدہ	محمد حسن سوڈر	215
قدردانی	اختر علی گھنگھرو	216
اساتذہ کا احترام	ناٹک گریلو	218
تاریخ ساز	محمود شام	220

www.bhutto.org

کل تک شہید بھٹو ایک موزوں قابل تبصرہ مضمون تھے اور آج وہ ایک مطالعاتی شخصیت ہیں اور کل بھی رہیں گے۔ لہٰذا وہ تمام اصحاب جو ان کو جانتے تھے اور جن کے لئے وہ ایک پسندیدہ شخصیت تھے ان پر یہ ایک قرض ہے کہ وہ ان کے، ان کے دور، قیادت اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے طور پر ان کی حیثیت کے بارے میں لکھ کر آئندہ نسلوں کے لئے حقائق کے حصول کا ذریعہ بنیں اور ساتھ ہی شہید بھٹو کو خراج عقیدت پیش کریں جو تاریخ میں اپنے نام کو جائز مقام دلانے کے لئے عوام کی خاطر زندہ رہے اور انہی کے لئے موت سے ہم آغوش ہوئے۔

میں مسٹر خورشید جونیجو جو شہید بھٹو کے ضلع لاڑکانہ سے تعلق رکھتے ہیں کی ممنوں ہوں کہ انہوں نے "بھٹو کی یادیں" کی ترتیب کا چیلنج قبول کیا۔ ساتھ ہی ان تمام اصحاب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے لئے مضامین لکھے اور اس کو ایک حقیقت بنایا۔

آخر میں میں کہوں گی کہ یہ کتاب ایک محبت کرنے والی بیٹی کی طرف سے ایک شفیق باپ کو نذرانہ عقیدت ہے۔ وہ نہ صرف ایک سیاسی رہنما تھے بلکہ خاندان کے لئے بھی ایک عظیم شخصیت تھے۔

میں نے ان سے سیکھا ہے کہ:۔۔۔

- بہترین چیز جو والدین اپنی اولاد کو دے سکتے ہیں وہ اچھی تعلیم ہے۔ تعلیم کے علاوہ ہر شے چھینی جا سکتی ہے۔
- کردار کی بلندی مادی فوائد سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ ہم قبر میں ایک اچھے نام کے علاوہ اور کچھ نہیں لے جا سکتے۔
- تمام مرد اور عورت برابر ہیں۔ اسلام میں بادشاہ اور فقیر ایک جیسے کفن میں سپرد خاک کئے جاتے ہیں۔
- کبھی بھی عارضی مفاد کی طرف مت جاؤ بلکہ تاریخ میں اپنا مقام پیدا کرو۔
- حقائق بدل جاتے ہیں! یہ وقت بھی گزر جائے گا۔
- آخری فتح عوام کی ہوتی ہے۔
- سیاست عوام کی خدمت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔
- میں گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کی ایک دن کی زندگی کو ترجیح دونگا
- عزت زندگی سے زیادہ اہم ہے۔

وہ ہم سے دور چلے گئے ہیں لیکن اب بھی ہمارے درمیان رہتے ہیں۔ میں ان کے چہرے کو نہ صرف اپنے بچوں میں بلکہ تمام بچوں اور آئندہ نسلوں میں دیکھتی ہوں جن کے لئے انہوں نے

www.bhutto.org

اپنی جان قربان کر دی۔

میں ان تمام اصحاب سے جو آئندہ نسلوں کے لئے شہید سے متعلق اپنی یادداشتوں کا حصہ ادا کرنا چاہتے ہوں گزارش کروں گی کہ وہ اپنے مضامین "بلاول ہاؤس" کراچی کے پتے پر مسٹر خورشید جونیجو کو ارسال کریں۔

دستخط

Benazir Bhutto

بے نظیر بھٹو

www.bhutto.org

پیش لفظ

میرے متعلق صرف وہی کہو جو میں ہوں!
نہ بے جا تعریف کرو اور نہ بغض!
(شیکسپیئر..... اوتھیلو)

''یادیں بھٹو کی'' ان مطبوعات میں سے ایک ہے جو آئندہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی۔ ملکی اور غیر ملکی عظیم قائدین نے جن کا بھٹو شہید سے تعلق رہا ہے ان کے متعلق اپنے تاثرات اور تجربات پر قلم آرائی کی ہے۔ ایک عوامی راہنما کی حیثیت سے ان کی مقبولیت، ان کا تدبر اور ان کے زندگی بھر کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ جس نے وقت کی ریت پر انمٹ نقش پا چھوڑے ہیں۔ سیاست میں ان کے منفرد انداز نے انہیں ابدیت اور ایک ایسے عنوان کی حیثیت دی ہے جس کا آپ جتنا مطالعہ کریں گے اتنا ہی آپ کو زندگی اور اس کے رموز سے واقفیت حاصل ہو گی۔

تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے عالمی سیاست میں تبدیلی کے عمل کے پس منظر میں جنوبی ایشیا کی سیاست کو سمجھنے کا عمل نامکمل ہو گا اگر وہ ان کی شخصیت اور عالمی عوامی تحاریک میں ان کے کردار اور اس کے عالمی اثرات کا مطالعہ نہ کرے۔

مختلف لوگ مختلف وجوہات کی بناء پر شہید ذوالفقار علی بھٹو میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ دانشوروں کو ان کے اندر ایک قد آور شخصیت نظر آتی ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ عالمی راہنما ان کی رفاقت میں خوشی محسوس کرتے تھے کیونکہ ان کے ساتھ تبادلہ خیال ان کے علم اور تجربات میں اضافہ کرتا تھا۔

تیسری دنیا کے مظلوم عوام کے لئے وہ ایک امید تھے جن کو فسطائی طاقتوں نے زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

ان کی اشتراکی معیشت اور جمہوری نظریات نے نہ صرف ان کو طاقت دی تھی بلکہ ان کے اس نظریہ کو قومی حیثیت دی تھی کہ طاقت کا اصل سرچشمہ عوام ہیں اور یہ کہ روٹی، کپڑا اور مکان

www.bhutto.org

ان کا حق ہے۔

دانشوروں اور تعلیمی تحقیق کے لئے وہ ایک ہمہ گیر کثیر الاطراف شخصیت ہونے کے علاوہ جیسا کہ ان پر لکھی گئی بے شمار کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے، وہ اس مقام سے بہت کم ہے جو انہوں نے عالمی سطح پر حاصل کیا ہے۔ "بھٹو کی یادیں" ان اصحاب کی یادداشتوں اور تجربات کو مجتمع کر کے شائع کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے جو ان کے بچپن کے ساتھی، طالب علم، دوست، سیاسی رفقاء، کارکن، وزراء اور افراد خاندان جو کسی نہ کسی صورت میں ان کی مثالی زندگی میں شریک کار تھے۔

ان سب نے اپنے اپنے انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے جنہوں نے ان کو ایک ابدی شعلہ بنا دیا ہے ان اسباب کو روشن کرنے کے لئے جن کا تعلق غریبوں اور نظر انداز کئے ہوئے لوگوں سے ہے تاکہ وہ ناامیدی کی تاریک سرنگ سے گزر سکیں۔ ان کی زندگی اور کارناموں کے قصے، بحران سے مقابلہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخصیت ہونا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد قوم کو ایک بہتر مستقبل کے لئے جس دلیرانہ قوت ارادی کا مظاہرہ انہوں نے کیا اور انسانی وقار کا باب جو انہوں نے اپنے خون سے تحریر کیا ایک آمر کے آگے جھکنے کے بجائے موت کو ترجیح نے انسانی وقار کی قیمت اور بلندی کے نئے باب کھولے ہیں اور وہ لازوال سوچ جو انہوں نے ورثہ میں چھوڑی ہے آج بھی باقی ہے۔ شہید بھٹو تاریخ کے دلدادہ اور ذہین طالب علم تھے۔ جس نے ان کو اس قابل بنایا کہ وہ ان کے ہم عمر اور ہمعصر راہنما جو ادب، تدبر اور سیاست میں نمایاں کردار ادا کر رہے تھے ان میں سے بہترین کا انتخاب کر سکیں اور اس طرح وہ ان لوگوں میں ایک قابل رشک مقام پیدا کر سکیں جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں انسانیت کی ترقی اور استعماری طاقتوں سے لڑنے میں مدد کی ہو۔

بہرحال ان پر لکھی گئی زیر نظر اور دوسری کتابیں یہ بتائیں گی کہ وہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے بہت متاثر تھے ان کے دوست پیلو مودی نے اپنی کتاب "زلفی، میرا دوست" میں ان کی قائداعظم سے لگاؤ اور وابستگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

> "زلفی کے لئے ہر وہ بات صحیح تھی جو جناح کہتے تھے۔ اور وہ جنون کی حد تک جناح کے دو قومی نظریئے، مطالبہ پاکستان اور فروغ اسلام سے وابستگی کے معترف اور قائل تھے۔"

میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ تاریخ بنانے میں چھوٹے اور بڑے کارناموں کو محفوظ کیا جانا چاہئے۔

www.bhutto.org

(ذوالفقار علی بھٹو کے قائداعظم کے نام خط کا ترجمہ جو انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ان کو لکھا تھا۔)

کرانکل ہوسٹل، مسوری

جنابِ من! صوبہ سرحد میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس نے مجھے اس قدر دلبرداشتہ کر دیا ہے کہ میرے اندر اپنے قائد کو یہ خط لکھنے کی ہمت پیدا ہوئی ہے۔

مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ ہندو کبھی ہمارے ساتھ متحد نہیں ہوں گے۔ وہ ہمارے قرآن اور رسول کے بدترین دشمن ہیں۔

ہمیں فخر ہونا چاہئے کہ آپ ہمارے قائد ہیں اور آپ نے ہم سب کو ایک پلیٹ فارم اور ایک پرچم تلے متحد کر دیا ہے۔ اور اب ہر مسلمان کی آواز "پاکستان" ہونا چاہئے۔ ہماری منزل اور مقصد صرف پاکستان ہے ہم نے آپ کے اندر ایک قابل راہنما پالیا ہے اور اب ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم بذاتِ خود ایک قوم ہیں اور ہندوستان ایک برصغیر لہٰذا ہمیں.....

شیخ عبداللہ یا ایسے ہی دوسرے جیسے ڈاکٹر خان صاحب کس طرح مسلمان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں جبکہ وہ کانگریس کی حکمتِ عملی کا شکار ہو گئے ہیں۔ مجھے دلی دکھ ہوتا ہے جب میں ان لوگوں کی لیگ کے خلاف احمقانہ تقاریر سنتا ہوں۔ کیا وہ حقائق سے بالکل ناواقف ہیں یا یہ ان کی حب الوطنی کے اظہار کا ایک انداز ہے۔ ایسے لاکھوں عبداللہ ہمیں اس نظریئے سے اتفاق کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ ہمارا نظریہ غلط ہے۔ آپ نے ہمیں ولولہ بخشا ہے اور ہمیں

www.bhutto.org

آپ پر فخر ہے۔

ابھی ایک اسکول کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں اپنے مقدس وطن کے قیام کے سلسلے میں کوئی مدد کرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن وقت آئے گا جب میں اپنے پاکستان کے لئے جان کی قربانی دوں گا۔

میرا تعلق صوبہ سندھ سے ہے۔ بے شک صوبہ سندھ بھی اس سلسلے میں مشکلات پیدا کر رہا ہے لیکن انشاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب سندھ بھی پاکستان کے لئے اپنا کردار ادا کرے گا۔

جناب والا! مجھے پورا احساس ہے کہ آپ ایک معروف شخصیت ہیں اور آپ کے پاس اسکول کے ایک لڑکے کا خط پڑھنے کا وقت بھی نہ ہو گا. لہٰذا جواب کی زحمت ضروری نہیں۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں احمقانہ باتیں کر رہا ہوں تو مجھے معاف فرمادیں، کیونکہ مجھے ان لاعلم لوگوں کی تقاریر پڑھ کر آپ کو یہ خط لکھنا پڑا۔

میں ہوں آپ کا

پیروکار

ذوالفقار علی بھٹو

www.bhutto.org

اعتراف

''یادیں بھٹو کی'' '' آپ کے زیر نظر ہے اس کو اس مرحلے تک پہنچانا کوئی آسان کام نہ تھا جو یقیناً تن تنہا میرے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

یہ میرے چند کرم فرماؤں اور احباب کا بھرپور تعاون تھا جس کی بناء پر میں یہ فریضہ انجام دے سکا۔ اس کی تدوین، طباعت اور خاص طور پر اردو زبان میں موصول ہونے والے مضامین کا انگریزی ترجمہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ میں شکر گزار ہوں جناب واجد شمس الحسن اور جناب تاج حیدر کا جنہوں نے اس کام کو انجام دینے میں بڑی محنت اور عرق ریزی کی۔ ان کے علاوہ اس کام کی انجام دہی میں مندرجہ ذیل اصحاب نے صاحبانِ مضامین سے ان کی تحاریر کے حصول اور تدوین میں قابل قدر کام کیا۔

جناب وقار عابد، پرسنل سیکرٹری۔ محترمہ بے نظیر بھٹو
مس ناہید خان، پولیٹیکل سیکرٹری، معاون چیئرپرسن۔ پی پی پی
ڈاکٹر صفدر عباسی، پولیٹیکل سیکرٹری، معاون چیئرپرسن۔ پی پی پی
جناب یوسف تالپور، نگران پی پی پی۔ سندھ سکریٹریٹ
جناب صادق جعفری

جناب جان نذار یتھ اور
جناب سید محمد رضا کاظمی۔

علاوہ ازیں احباب کی ایک بڑی تعداد نے جن کی فہرست بہت طویل ہے مختلف طریقوں سے بھرپور تعاون کیا۔

'' بھٹو میموریل سوسائٹی '' ان تمام اصحاب کے اس قابل قدر تعاون پر تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہے۔

خورشید جونیجو
مُرتب

www.bhutto.org

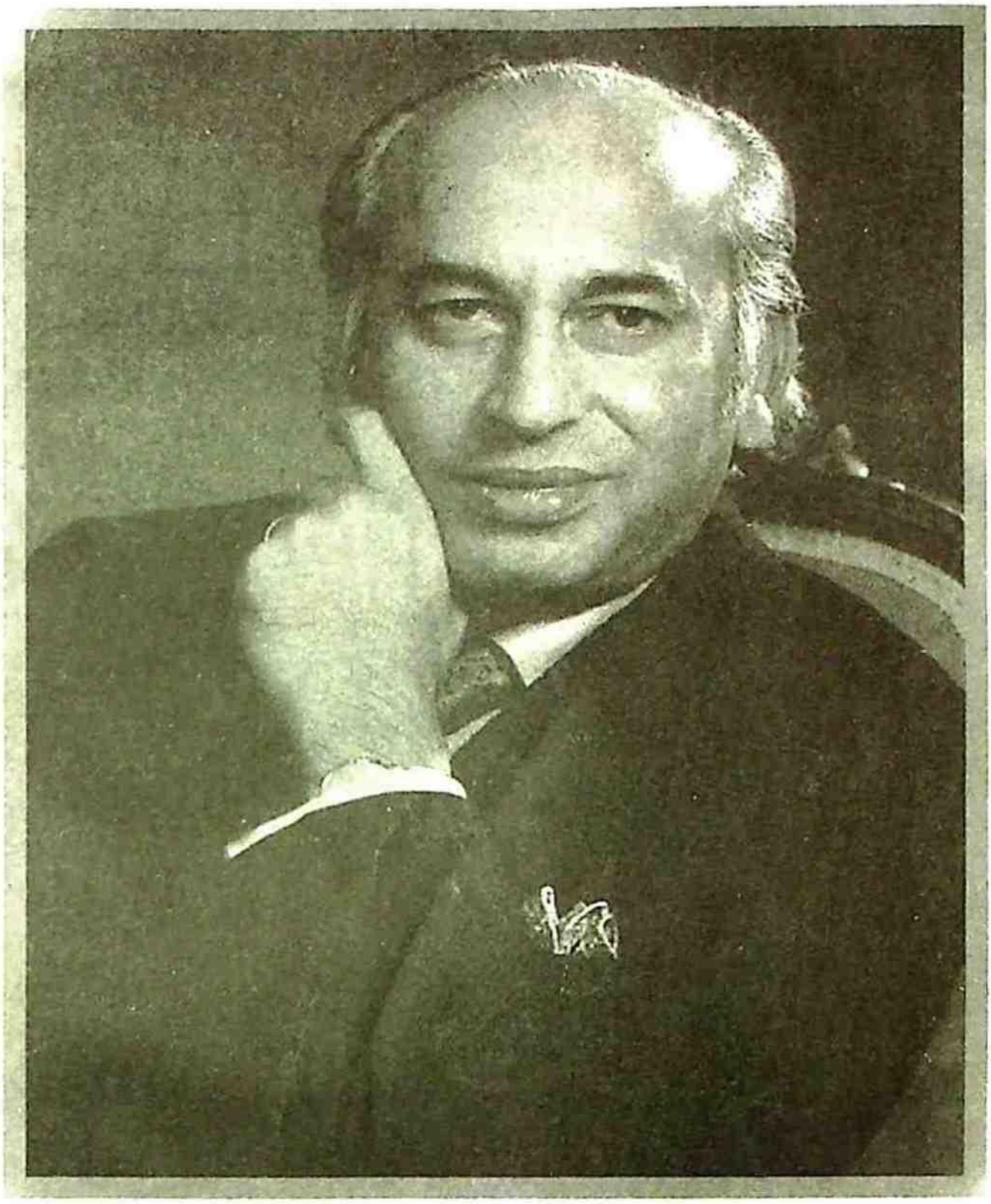

ذوالفقار علی بھٹو کی ایک مسکراتی یادگار تصویر

www.bhutto.org

وہ ایک محبت کرنے والے شوہر تھے

بیگم نصرت بھٹو

سوال:۔ کیا آپ اپنے بچپن اور خاندانی پس منظر کے متعلق بتائیں گی؟

جواب:۔ ہمارے خاندان کا تعلق ایران سے ہے۔ میرے پردادا کے تین بیٹے تھے۔ ایک کو انہوں نے ریشم سازی کی تربیت کے لئے چین بھیج دیا تھا دوسرے بیٹے کو وہ عالم دین بنانا چاہتے تھے لہٰذا ان کو نجف اشرف بھیج دیا تاکہ وہ علم دین حاصل کریں۔ تیسرے بیٹے کو انہوں نے اپنے ساتھ ہی رکھا تاکہ وہ زمینوں کی دیکھ بھال اور کاشتکاری کرے۔ جس بیٹے کو عالم دین بنانے کے لئے نجف اشرف بھیجا گیا تھا وہ میرے دادا تھے۔ ان کے والد نے آیت اللہ کی حیثیت سے میرے دادا کی نجف اشرف سے واپسی پر تبلیغ دین کے لئے ایک مسجد اصفہان میں تعمیر کرائی تھی لیکن وہ یہ کام شروع کرنے سے قبل ہی وفات پا گئے۔ یہ مسجد بہت خوبصورت ہے اور آج بھی موجود ہے۔ میرے والد مرزا محمد نجف میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی والدہ سید اور والد غیر سید تھے۔ ان کا خاندانی نام مرزا عبداللطیف اصفہانی تھا۔ وہ ایک جدید آدمی تھے اور عالم دین نہیں بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے نجف میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اور ان کے چند دوست چھٹیاں گزارنے ہندوستان کے شہر بمبئی گئے۔ وہاں سے واپسی پر

www.bhutto.org

انہوں نے اپنے والد اور دادا کو بتایا کہ وہ ہندوستان میں صابن سازی کا کارخانہ لگانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میرے والدین ہندوستان منتقل ہو گئے اور بمبئی میں "بغداد سوپ انڈسٹری" قائم کی، اور میری پیدائش بھی وہیں یعنی بمبئی میں ہوئی۔

میں اپنے والدین کی تیسری بیٹی تھی۔ میرے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا جس پر مجھے نیک بختی کی علامت سمجھا گیا، اور پھر سب کی پیاری اور لاڈلی بن گئی۔ یہ برطانوی راج کے آخری ایام تھے۔ میرے والد صابن سازی سے متعلقہ سامان خریدنے اکثر کراچی جاتے تھے۔ میں بمبئی کے ایک اسکول میں زیر تعلیم تھی۔ جب میں نے سینئر کیمرج پاس کر لیا تو میرے والدین نے یہ کہہ کر کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں، مجھے برقعہ اوڑھنے کی ہدایت کی کیونکہ اب میں حجاب کے بغیر کہیں آ جا نہیں سکتی تھی۔ میرے والد بہت سادہ اور نرم دل انسان تھے، اور اکثر غریب رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

میں نے برقعہ اوڑھ کر کالج جانے سے انکار کر دیا۔ میری ایک بھانجی بھی کالج جاتی تھی۔ وہ بہت شریر تھی۔ گھر سے تو وہ برقعہ اوڑھ کر نکلتی تھی لیکن کار میں بیٹھتے ہی اسے اتار پھینکتی تھی اور واپسی پر گھر پہنچنے سے پہلے پھر اوڑھ لیتی تھی۔ اس کے والدین سمجھتے تھے کہ ان کی بیٹی بڑی فرمانبردار ہے، لیکن میں اپنے والدین کو دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی یا یوں سمجھ لیجئے کہ میں بیوقوف اور بدھو تھی۔ مجھے کافی عرصہ تک اپنی بھانجی کے اس طریقہ کار کا علم نہیں ہو سکا۔ میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کر سکی اور مجھ بہت افسوس ہے کہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے ....

تو یہ تھے میرے بچپن کے دن!

سارے گھر کے افراد مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری بڑی بہنیں عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں۔ پہلی چودہ سال اور دوسری تیرہ سال بڑی تھیں۔ ان کی شادیاں کم عمری میں کر دی گئی تھیں لہٰذا ان کے بچے تقریباً میرے ہم عمر تھے۔ فخری ان میں سے ایک ہے۔ وہ میری سب سے بڑی بہن صفیہ خانم کی بیٹی ہے۔ فخری اور میں ایک ساتھ پلے بڑھے۔

سوال:۔ ایک قدامت پسند خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ اور فخری بیگم دو آزاد خیال خواتین تھیں؟

جواب:۔ میرے والد قدامت پسند نہیں تھے۔ اور ہماری ہمت افزائی کرتے تھے۔ میری والدہ

www.bhutto.org

پرانی طرز کی تھیں، اور مجھے برقعہ پہننے کو کہتی تھیں۔ درحقیقت ان دنوں خواتین عام طور پر برقعہ اوڑھتی تھیں۔

جب میری شادی ہوئی تو میرے شوہر کے خاندان والوں نے چاہا کہ میں کم از کم لاڑکانہ میں برقعہ ضرور پہنا کروں، لہٰذا میں جب بھی لاڑکانہ جاتی تو برقعہ اوڑھتی تھی۔ کافی عرصہ بعد جب میرے شوہر وزیر بن گئے اور میرے خسر کا انتقال ہو گیا تو میں نے برقعہ ترک کر دیا۔ ایک مرتبہ میرے شوہر نے کہا تھا کہ برقعہ بڑی مضحکہ خیز چیز ہے اور مجھے اسے ترک کر دینا چاہئے۔ ایک مرتبہ جب میں ان کے ساتھ بذریعہ ہوائی جہاز لاڑکانہ جا رہی تھی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ برقعہ نہ اوڑھوں، لہٰذا میں نے اسے اتار پھینکا۔

سوال:۔ آپ کی مسٹر بھٹو سے ملاقات کیسے ہوئی؟

جواب:۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے۔ اپنے بچپن میں جب میں بمبئی میں تھی تو ہم بمبئی کے قریب ایک پہاڑی علاقے کھنڈالہ جایا کرتے تھے۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا سمر ہاؤس تھا۔ جہاں سے ہم کبھی لونا والہ جایا کرتے تھے جو کھنڈالہ سے قریب ہی تھا۔ مجھے ہلکا ہلکا سا یاد ہے کہ میں گیارہ سال کی تھی ہم سب وہاں چہل قدمی کر رہے تھے اور ان کے خاندان کے افراد بھی وہاں موجود تھے، اور وہیں ہمارے اور ان کے افراد خاندان کی ملاقات ہوئی۔ وہ لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے اور ہم بچے ایک طرف تفریح اور باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں اور وہ خود تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا تعلق سندھ سے ہے۔ میں کراچی کو تو جانتی تھی لیکن سندھ کے متعلقہ کچھ نہیں جانتی تھی، اور ہم نے ان سے سندھ کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے؟ اور انہوں نے ہم کو سندھ کے متعلق بتایا۔ یہ تھا وہ موضوع جس پر اس دن ہم لوگوں کی گفتگو ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگ دو بار ملے تھے، لیکن مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں۔ اس کے بعد ہم لوگ کراچی منتقل ہو گئے۔ ان کی بہن "منا" (بیگم منور الاسلام) میری سہیلی تھیں۔ جب اس کی شادی ہوئی تو انہوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ میں لاکر سے اپنے زیورات نکلوانے بنک گئی۔ میں نے ان کو وہاں کھڑے دیکھا۔ وہ اب بڑے ہو گئے تھے اور میں پہلی نظر میں ان کو نہ پہچان سکی۔ ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ وہاں موجود تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ، منا، میری سہیلی ہے۔ انہوں نے کہا

"ارے نصرت! یہ میرا بیٹا ہے۔ حال ہی میں امریکہ سے آیا ہے۔

www.bhutto.org

اور اس کا نام زلفی ہے۔

اب مجھے یاد آیا کہ میری سہیلی منانے جواب مسز ہدایت اللہ ہے۔ مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے جو وجیہہ اور دراز قد ہے۔ میں نے ان کو بچپن میں دیکھا تھا اور بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کیسے تھے۔ بنک کے اندر کافی روشنی نہیں تھی، یا جو کچھ بھی ہو وہ مجھے پہلی نظر میں اچھے نہیں لگے۔ جوان ہونے کے بعد یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ہم شادیوں اور ان سے متعلقہ دوسری رسومات کے مواقع پر ملتے رہے. اور مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ بہت مہذب تھے۔ مختلف تقریبات اور تفریحات کے مواقع پر میری ملاقات کئی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے ہوتی تھی جو زیادہ تر بے ہودگی اور ناشائستگی کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن بھٹو نہایت مہذب اور باوقار نظر آتے تھے۔

سوال:۔ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟

جواب:۔ میں بیس سال کی تھی۔

سوال:۔ اس کے بعد کیا ہوا. کیا انہوں نے شادی کی تجویز پیش کی؟

جواب:۔ نہیں! انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں پاکستان نیشنل گارڈز میں شامل ہو گئی تھی اور فوج میں میری حیثیت ایک کیپٹن کی تھی۔ میری سہیلی جواب بیگم حبیب اللہ ہیں. بحریہ میں ملازم تھیں۔ منا کی شادی کے کچھ دن بعد ہم دونوں اسے مبارکباد دینے گئے. اور یہ دیکھنے بھی کہ شادی کے بعد اس کی کیسی گزر رہی ہے۔ ہم دونوں اپنی فوجی وردی میں تھے۔ وہاں پر وہ (بھٹو) بھی موجود تھے. اور وہاں ان سے ہماری ملاقات ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے ہم کو اس وردی میں پسند نہیں کیا. کیونکہ بعد میں انہوں نے اپنی بہن سے دریافت کیا کہ یہ دونوں لڑکیاں کیا "شے" ہیں؟ اس کے بعد وہ تعلیم کے سلسلہ میں پھر امریکہ چلے گئے. اور پھر..... اب میں راز کی ہر بات تو نہیں بتا سکتی. یا بتا دوں..... چلئے بتا دیتی ہوں..... کچھ دن بعد ان کے ایک دوست جو خود بھی امریکہ میں زیر تعلیم تھے امریکہ سے آئے اور مجھ سے ملاقات کی اور بتایا کہ زلفی نے میرے لئے محبت کا پیغام بھیجا ہے۔ فوری طور پر ان کا نام میرے ذہن میں نہیں آیا اور میں نے دریافت کیا "کون زلفی؟" ان کے دوست نے واپس امریکہ جا کر ان کو بتایا کہ انہوں نے ایک ایسی خاتون کو پیام محبت بھیجا تھا جو ان کو جانتی تک نہیں۔

www.bhutto.org

دو سال بعد وہ خود وطن واپس آئے اس وقت وہ آکسفورڈ میں زیر تعلیم تھے۔ ہماری ملاقات ایک سہیلی کی سالگرہ کی تقریب میں ہوئی۔ وہ میرے قریب آئے اور دریافت کیا

"کیا میں اپنا تعارف کراؤں، یا آپ مجھے جانتی ہیں؟"

میں نے جواب دیا "جی ہاں" اور پھر وہاں سے چلے گئے اور میرے لئے آئس کریم لے آئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے دعوتوں کے اہتمام کرانا شروع کر دیئے جن میں مجھے بھی مدعو کیا جاتا تھا۔

اور پھر اس نوعیت کی دعوتوں میں ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن ہم تنہائی میں کبھی نہیں ملے۔ اس کے بعد انہوں نے شادی کی تجویز پیش کی۔

سوال:۔ کیا آپ کو اس کا صحیح وقت یاد ہے؟

جواب:۔ منا کی شادی ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی اور انہوں نے شادی کی تجویز ۱۹۵۱ء میں پیش کی تھی، اور پھر ہماری شادی ہو گئی۔ یہ شادی کراچی میں ہوئی تھی۔ جس کے بعد میں ان کے ساتھ ہنی مون پر چلی گئی۔ اس زمانے میں ان کا خاندان کلفٹن برج کے نیچے میک نیل روڈ پر واقع ایک مکان میں رہائش پذیر تھا۔ میں ان کے ساتھ اسی مکان میں رہی، اور وہیں بے نظیر پیدا ہوئی، لیکن شادی کے فوراً بعد میں ان کے ساتھ آکسفورڈ چلی گئی تھی۔ یہ ان کا وہاں پر تعلیم کا پہلا سال تھا اور ضوابط کے مطابق وہ ہوسٹل سے باہر نہیں رہ سکتے تھے لہٰذا مجھے ہوٹل میں رہنا پڑا جبکہ وہ ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہم دونوں دن کے وقت ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ایک رات وہ ہوسٹل واپس نہیں گئے۔ دوسرے دن انہوں نے اپنے ڈین (Dean) کو بتا دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے۔ وہ اس وقت اتنے کم عمر تھے کہ ڈین کو ان کی اس بات کا یقین نہیں آیا، لہٰذا وہ مجھے ڈین کے پاس لے گئے۔ جس پر ڈین نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے، اور ان کو رات باہر رہنے پر کوئی سزا نہیں دی۔

سوال:۔ سر شاہ نواز کس قسم کے انسان تھے؟

جواب:۔ وہ اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ جب ہم آکسفورڈ میں تھے تو وہ بار بار مجھے وہاں سے واپس آنے کو لکھتے رہتے تھے۔ آخر کار میں واپس آگئی اور اپنی سسرال میں رہنے لگی، لیکن میں اس پر خوش نہیں تھی کیونکہ اس دوران مجھے اپنے شوہر سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، اور میں ان کے ساتھ ہی رہنا چاہتی تھی۔ میرے

www.bhutto.org

سسر اور ساس یہ سمجھتے تھے کہ اگر میں اپنے شوہر کے ساتھ رہی تو وہ تندہی سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے گا۔ ہم دونوں ٹیلی فون پر بات کرتے تھے اور میں روتی تھی کہ میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ بعد میرے والد نے میرے لئے ٹکٹ خریدے اور میں آکسفورڈ اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ میں امید سے ہو گئی اور میں نے ان کو بتایا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس پر وہ اتنا خوش ہوئے کہ سڑک پر نکل گئے اور چیخنا شروع کر دیا "میں باپ بننے والا ہوں" اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں بے نظیر پیدا ہوئی۔

سوال:۔ کسی نے مجھے بتایا ہے کہ مسٹر بھٹو کی ایک بہن تھی جس کا نام بھی بے نظیر تھا۔ وہ بہت ہی کمسنی میں وفات پا گئی تھی اور انہوں نے اپنی بیٹی کا نام اپنی بہن کے نام پر رکھا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:۔ جی ہاں! یہ آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے جب وہ پونا میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور اسکول کے ہوسٹل میں رہتی تھی۔ اس کی ڈائری پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے گھر واپس جانا چاہتی تھی. لیکن وہ کسی دماغی مرض میں مبتلا ہو کر بہت ہی کم سنی تقریباً پندرہ سال کی عمر میں انتقال کر گئی. اور اسے پونا ہی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میری ساس نے ہماری بیٹی کا نام بے نظیر رکھا۔

سوال:۔ آپ کی ساس کیسی خاتون تھیں؟ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں؟

جواب:۔ میری خوشدامن کے متعلق بہت سی باتیں مشہور ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس بارے میں حتمی فیصلہ ہو جائے۔ میری خوشدامن بیگم خورشید تھیں۔ ان کی والدہ نو مسلم تھیں۔ مسٹر ہدایت اللہ نے جو اس وقت تک "سر" نہیں بنے تھے ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ ان سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بیگم خورشید ان میں سے ایک تھیں۔ بعد میں مسٹر ہدایت نے ان کو طلاق دے کر ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔ بیگم خورشید کی بڑی بہن نے ایک شخص کے ساتھ جس کا نام شاید میر مقبول احمد خاں تھا شادی کر لی۔ میر مقبول احمد خان سر شاہ نواز بھٹو کے گہرے دوست تھے۔ سر شاہنواز بھٹو کی پہلی بیوی بوڑھی ہو چکی تھیں اور وہ دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ میر مقبول احمد خان نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ان کی بیوی کی بہن خورشید سے شادی کر لیں. اور اس طرح سر شاہنواز نے خورشید بیگم سے

www.bhutto.org

شادی کر لی۔

سوال:۔ کیا مسٹر بھٹو ان خاتون سے اکلوتے بیٹے تھے؟

جواب:۔ جی ہاں! دوسرے دو بھائی اور چار بہنیں پہلی بیوی سے تھیں اور ایک بیٹا اور تین بیٹیاں دوسری بیوی خورشید بیگم سے تھیں۔ وہ ایک قدامت پسند اور مذہبی خاتون تھیں۔ میں ان کے ہمراہ نجف شریف، کربلا اور بغداد زیارت کے لئے گئی۔ وہ ایک اچھی مسلمان تھیں۔ وہ خود برقعہ اوڑھتی تھیں اور جب میں لاڑکانہ جاتی تھی تو مجھے بھی برقعہ اوڑھنے کی ہدایت کرتی تھیں۔

بہرحال آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد مسٹر بھٹو کو اسی یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی لیکن ان کے والدین نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا انگلینڈ میں رہے، لہٰذا انہوں نے ان کو مجبور کیا کہ وہ کراچی واپس آ جائیں۔ کراچی میں وہ کبھی کبھی سندھ مسلم لاء کالج میں لیکچر دینے جاتے تھے لیکن درحقیقت وہ دفتر خارجہ میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔

سوال:۔ جب آپ ان سے پہلی بار ملی تھیں تو کیا آپ نے یہ تصور کیا تھا کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں کیا کریں گے؟

جواب:۔ نہیں! اس وقت وہ ایک طالب علم تھے لیکن میں یہ اندازہ ضرور کرتی تھی کہ وہ ایک نمایاں شخصیت ہیں۔

سوال:۔ اس کے علاوہ آپ نے اور کیا اندازے لگائے تھے؟

جواب:۔ ان کے اندر ایک عجیب سی جاذبیت اور کشش تھی جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

سوال:۔ وہ کس شخصیت سے متاثر تھے؟

جواب:۔ ان کی تربیت بہت اچھے طریقہ پر ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی والدہ سے متاثر ہوں۔ ان کے والد بھی ان کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔ ان کے چچا احمد خان بھٹو سیاست میں تھے، اور مسٹر بھٹو کی پہلی بیوی کے والد بھی تھے۔ میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ بتاتی ہوں، کہ جب ہماری شادی ہوئی تو ان کی پہلی بیوی کے والد نے ہم کو کراچی کلب میں ایک شاندار پارٹی دی، کیونکہ سندھ میں دوبارہ شادی کرنا کوئی معیوب یا نئی بات نہیں تھی۔

سوال:۔ کیا آپ کو علم تھا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ تھے؟

www.bhutto.org

جواب:۔ ابتدا میں مجھے یہ بات نہیں معلوم تھی۔ ہوا یوں کہ میں نے ان سے شادی کی خواہش کا اپنے والدین سے اظہار اپنی بڑی بہن کی وساطت سے کیا تھا۔ پہلے انہوں نے میری اس خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ایک ایرانی خاندان کس طرح کسی سندھی خاندان کے لڑکے کا رشتہ قبول کر سکتا ہے۔ جسے وہ جانتا تک نہیں۔ اس وقت میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری دادی اور بڑی بہنیں موجود تھیں۔ کچھ دن بعد جیسا کہ مجھے یاد پڑتا ہے، ہارون خاندان کے چند افراد ہمارے گھر آئے اور اس مسئلے پر گفتگو کی جس کے دوران ہارون خاندان والوں نے یہ انکشاف کیا کہ بھٹو پہلے ہی شادی شدہ ہیں اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "اف میرے خدا!" میرے والدین نے مجھے بہت لعنت ملامت کی اور ناراض ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسے آدمی سے کیسے شادی کر سکتی ہوں جو پہلے ہی شادی شدہ ہے، اور اپنے خاندان سے رشتہ توڑ رہا ہے۔ کچھ دن بعد خود بھٹو میرے افراد خاندان سے ملنے آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ "آپ نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں۔" اس پر انہوں نے وہ حالات بیان کئے جن کی وجہ سے وہ شادی ہوئی تھی۔ بعد میں وہ اپنی والدہ کو لے کر آئے جنہوں نے ہمارے خاندان والوں کو بتایا کہ بھٹو کی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ صرف چودہ برس کے تھے اور اتنے ناسمجھ تھے کہ صرف ان کے پسندیدہ کرکٹ کے بلّوں کا سیٹ دینے کی لالچ دے کر ان کو نکاح میں بٹھایا تھا۔

سوال:۔ وہ کس طرح کے آدمی تھے؟

جواب:۔ ان کے بہت کم دوست تھے۔ ان کے متعلق شاید یہ بات کسی کو نہ معلوم ہو کہ وہ بہت شرمیلے تھے۔ وہ مطالعہ کے بہت شوقین تھے، اور مجھے بھی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ مجھے پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے تھے اور انہیں پڑھنے پر مجبور بھی کرتے تھے۔ بچوں کی پیدائش کے موقع پر وہ مجھے نفسیات کی کتابیں پڑھنے کو دیتے تھے تاکہ میں اپنے بچوں کو سمجھ سکوں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے کوئی ایسی حرکت کریں جس سے ان کے خاندان کی بدنامی ہو۔

سوال:۔ آپ دونوں ہنی مون کے لئے کہاں گئے تھے؟

جواب:۔ پیرس اور روم! دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سفر میں میری ساس بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ ان کی بیٹی ممتاز کی شادی کرنل مصطفیٰ سے ہوئی تھی جو اس وقت ترکی میں متعین تھے۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی تھیں. لہٰذا ہم ان کو بھی اپنے

www.bhutto.org

ساتھ لے گئے۔ ہم روم اور پیرس ہوتے ہوئے ترکی گئے جہاں وہ اپنی بیٹی کے پاس ٹھہر گئیں اور ہم دونوں لندن چلے گئے۔

سوال:۔ وہ ایوب خان کی کابینہ میں کس طرح شامل ہوئے؟

جواب:۔ میرا خیال ہے کہ ان کے والدین اور سکندر مرزا کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے، اور وہ اکثر ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دن سکندر مرزا نے ان کے والدین سے کہا کہ وہ ان کے بیٹے کو وزیر بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک کتابچہ شائع کرا چکے تھے جس کا عنوان تھا "فیڈرل یا یونیٹری گورنمنٹ" اور حکوت ان سے اس بات پر بہت ناراض تھی۔ بعد میں ان کو ایک عامی کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا گیا اور پھر وہ وزیر تجارت بن گئے۔ بعدازاں سکندر مرزا کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اس وقت ہم لوگ لاڑکانہ میں تھے، اور کراچی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا، لیکن بار بار ٹیلی فون آتے رہے کہ ایوب خان ان کو وزیر بنانا چاہتے ہیں، اور ہم سب اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ یہ پیشکش منظور کرنی چاہئے یا نہیں۔ اس وقت تک مسٹر بھٹو کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی والدہ اور خود میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر لیں، اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

سوال:۔ کیا وہ آپ سے سیاست پر تبادلہ خیال کرتے تھے؟

جواب:۔ کبھی کبھی! لیکن میں نے اپنا نظریہ یا رائے کبھی ان پر مسلط نہیں کی۔ میں صرف اپنی رائے اور سوچ کا اظہار کر دیتی تھی، کبھی وہ میری بات سے اتفاق کرتے تھے اور کبھی رد کر دیتے تھے۔

سوال:۔ شوہر کی حیثیت سے وہ کیسے تھے؟

جواب:۔ وہ ایک بہت ذمہ دار شوہر تھے۔ میں کبھی کبھی معمولی باتوں پر غصہ کرتی تھی لیکن وہ برا نہیں مناتے تھے۔ وہ ایک محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لوگ ان کے پاس آتے تھے اور ان کو لمبے لمبے مشورے دیتے تھے۔ وہ خاموشی اور توجہ سے ان کو سنتے رہتے تھے، اور آخر میں اپنے فیصلے کا اظہار کرتے تھے جسے وہ بہتر سمجھتے تھے۔ وہ کبھی اپنے بچوں پر غصہ نہیں کرتے تھے، اور ان سے بڑے پیار سے بات چیت کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو مارا پیٹا نہیں۔ جب وہ وکیل تھے تو انہوں نے قتل کے ایک مقدمہ میں ایک بوڑھے آدمی کی پیروی کی۔

www.bhutto.org

بوڑھے نے ان کو بتایا کہ اس نے قتل نہیں کیا اور اس کو غلط طور پر اس میں ملوث کیا گیا ہے۔ اس بوڑھے نے مقدمہ کی فیس کا کچھ حصہ بطور پیشگی ان کو ادا کر دیا۔ یہ مسٹر بھٹو کا پہلا مقدمہ تھا۔ وہ رقم انہوں نے مجھے دے دی جو میرے پاس کافی عرصہ رکھی رہی۔ دوسرے مقدمہ میں جب ان کو کامیابی ہوئی تو ان کا موکل مقدمہ کی فیس کے طور پر اپنی کمسن بچی کو لے آیا. مسٹر بھٹو اس بچی کو لے کر میرے پاس آئے اور کہا

"دیکھو نصرت! یہ میرے مقدمہ جیتنے کی فیس ہے کیا تم اسے لینا چاہتی ہو؟"

وہ بہت کمسن بچی تھی اور انہوں نے اسے اس کے والدین کو واپس کر دیا۔

سوال:۔ وہ اپنی کامیابی یا خوشی کا اظہار کس طرح کرتے تھے؟

جواب:۔ وہ ایسے موقعہ پر خاموش رہتے تھے۔ نہ جانے کیوں ان کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ وہ جوانی میں انتقال کر جائیں گے. اور یہ بات انہوں نے مجھ سے اس وقت بھی کی تھی جب انہوں نے مجھ سے شادی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا "ہم کو جلد شادی کر لینی چاہئے کیونکہ میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔"

میں نے جب ان سے اس واہمہ کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ وہ اس کی صحیح وجہ نہیں بتا سکتے لیکن انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ خاندان میں ان کے کئی دشمن ہیں جو ان کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے بچپن میں ایک نجومی نے ان کے والد مسٹر بھٹو کی تعلیم کی تفصیل بتائی تھی اور یہ بھی کہ وہ کس طرح شہرت پائیں گے اور یہ سب اڑتالیس سال کی عمر تک ہو گا. اور واقعی یہ ان کی زندگی کا اڑتالیسواں سال تھا جب پی۔ این۔ اے نے ان کے خلاف مظاہرے شروع کئے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۱ء کے پہلے انتخابات کے موقع پر میں صبح صبح بیدار ہوئی۔ میں نے ان کو بیدار کیا اور بتایا کہ ہم کو جلد باہر جا کر حالات کا جائزہ لینا ہے۔ وہ انتخابات کے نتائج کے بارے میں کافی فکر مند تھے. اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر سن رہے تھے. اور جب تک آخری اطلاعات نہیں آ گئیں وہ فکر مند اور خاموش رہے۔ اس کے بعد وہ بہت خوش تھے لیکن ساتھ ہی شرمیلے بھی۔ یہاں تک کے میرے سامنے بھی اپنی خوشی کا اظہار نہ کر سکے۔ وہ بہت سنجیدہ تھے۔

وہ ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اپنی وزارت کے دور میں وہ رات تین بجے تک اپنی فائلوں میں غرق رہتے تھے اور ان پر کارروائی میں مصروف رہتے تھے۔

www.bhutto.org

حتیٰ کہ وہ اپنے بستر پر بھی اپنا کام جاری رکھتے تھے، اکثر ان کے کاغذات کی الٹ پلٹ کی آواز سے میں سو نہیں پاتی تھی۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ مزید کام کرنا چاہتے ہیں تو میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں، لیکن وہ مجھے ایسا نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ مطالعہ اور کام سے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ وہ تقریباً ہر رات تین بجے تک کام کرتے تھے اور پھر صبح آٹھ بجے دفتر جانے کے لئے بیدار ہو جاتے تھے۔ وہ بہت کم سوتے تھے۔

سوال:۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ بہت شرمیلے تھے، لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ بہت دلیر اور بہادر آدمی تھے۔

جواب:۔ نفسیاتی لحاظ سے میں سمجھتی ہوں کہ اگر کوئی شخص شرمیلا ہوتا ہے تو اپنی اس عادت کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور اس مقصد کے لئے کوئی بڑا کام انجام دیتا ہے۔ دراصل میں بھی بہت شرمیلی ہوں لیکن اپنے عمل اور تاثرات سے یہی ظاہر کرتی ہوں کہ میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ ان کی ایک عجیب عادت یہ تھی کہ اگر وہ چاہتے تو صرف پانچ یا دس منٹ سو کر اپنی نیند پوری کر لیتے تھے اور اس دوران وہ گہری نیند سوتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ یہ کہہ کر سوتے تھے کہ ان کو دس منٹ بعد بیدار کر دیا جائے اور یہ کہتے کہتے وہ خراٹے لینا شروع کر دیتے تھے۔ یقین کیجئے میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہی ہوں۔ صرف دس منٹ کے بعد جب میں ان کو بیدار کرتی تھی تو وہ بالکل تر و تازہ ہوتے تھے۔ میں جب ان سے سوال کرتی کہ وہ اس طرح کیسے سو جاتے ہیں۔ تو وہ جواب دیتے تھے کہ ان کا ضمیر مطمئن ہے اس لئے بے فکری سے اس طرح سو جاتے ہیں۔ وہ اکثر ایسا کیا کرتے تھے کیونکہ بیشتر وقت وہ کام کرتے تھے اور جب تھک جاتے تو چند منٹ کے لئے سو جاتے تھے۔

سوال:۔ اوریانہ فیلاسی (Oriana Fallacci) نے مسٹر بھٹو کے ساتھ ایک انٹرویو کے حوالے سے لکھا ہے کہ مسٹر بھٹو متضاد شخصیت کے مالک تھے۔ وہ دولت مند تھے لیکن غریبوں کے ہمدرد۔ وہ ایک جاگیردار تھے لیکن ساتھ ہی سوشلسٹ۔ وہ کٹر مسلمان بھی تھے اور آزاد خیال بھی! اس سلسلے میں آپ کیا کہینگی؟

جواب:۔ ان کے خاندان کا پس منظر جاگیردارانہ تھا، لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ انہوں نے امریکہ اور انگلستان میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد نے پہلے ان کو امریکہ بھیجا جو بہت ہی جدید ملک ہے۔ اس کے بعد آکسفورڈ بھیجا تاکہ ان کی تعلیم میں توازن قائم

www.bhutto.org

ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا دل بہت نرم تھا۔ وہ ہر فیصلہ اپنے دماغ سے کرتے اور کبھی بھی بے وقوفوں کی طرح کام نہیں کیا، یا جو بھی منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ وہ صرف اسی کام کی منصوبہ بندی کرتے تھے جسے وہ واقعی کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک کے لوگ غریب کیوں رہیں جبکہ دیگر ممالک میں ہر شخص خوشحال ہے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جوہری توانائی کو پاکستان میں روشناس کرایا۔ اس وقت وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے وزیر تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ایک خاکروب ذات کے فرد کو سفیر بنایا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ایک خاتون بیگم رعنا لیاقت علی خان کو گورنر (سندھ) بنایا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی ایسے کام کئے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کئے تھے۔ وہ درگزر کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے ایسے کئی افراد کو معاف کر دیا تھا جو ان کے ساتھ برائی کرتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جنہوں نے کبھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہو۔ جب وہ وزیر قانون تھے تو اکثر سکندر مرزا سے ملنے لندن جایا کرتے تھے کیونکہ سکندر مرزا ان کے شفیق تھے۔ اور وہ یہ اس وقت کرتے تھے جب وہ ایوب خان کی کابینہ میں شامل تھے اور ان کا یہ عمل ایوب خان کی ناراضگی کا سبب بھی بنتا تھا۔ جب سکندر مرزا کا انتقال ہوا تو ہم تعزیت کے لئے ان کی بیگم سے ملنے گئے۔ ایوب خان دوسرے شخص تھے جو کبھی ان پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے ان کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں گل جی کی بنائی ہوئی ایوب خاں کی پینٹنگ آویزاں تھیں، اور انہوں نے کبھی بھی اس کو وہاں سے ہٹا کر گودام میں نہیں پھینکا۔

وہ پینٹنگ آج بھی "المرتضیٰ" کے ڈرائنگ روم میں آویزاں ہے تاکہ ہر شخص دیکھ سکے اور اندازہ کر سکے کہ بھٹو کس کردار کے مالک تھے۔

سوال:۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہونے کے سانحہ کے سلسلے میں مسٹر بھٹو کے کردار کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے۔ کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ بتائیں گی؟

جواب:۔ جب ایک اخبار نے ان پر ملک توڑنے کا الزام لگایا تو انہوں نے اسی وقت اس کی تردید کی تھی۔ جب مجیب الرحمٰن کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو انہوں نے اس کی جان بخشی کی درخواست کی اور کہا کہ ایسا کرنا بہت برا ہو گا۔ انہوں نے جیل میں مجیب الرحمٰن۔ ملاقات کی اور بتایا کہ وہ ان کو رہا کر رہے ہیں، لیکن ان کو چاہئے کہ وہ وطن دشمن سرگرمیاں ترک کر دیں۔ ان دونوں کی گفتگو ٹیپ کی جا رہی تھی۔ مجیب بہت

www.bhutto.org

چالاک آدمی تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ ان کی گفتگو کو ریکارڈ کیا جارہا ہے۔ وہ اپنا تمباکو پینے کا پائپ میز پر مار مار کر آواز پیدا کرتا رہا تاکہ صحیح ریکارڈنگ نہ ہو سکے۔ مسٹر بھٹو نے ملک بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ آپ جانتے ہوں گے محمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں جنرلوں کو اس کا مورد الزام ٹھہرایا گیا تھا۔ میرے پاس کمیشن کی رپورٹ کی ایک نقل موجود تھی لیکن وہ الماری توڑ کر اسے نکال لے گئے۔ ہم کو معلوم تھا کہ ایسا ہو گا. مسٹر بھٹو نے مجھے جیل میں بتا دیا تھا کہ وہ رپورٹ حاصل کرنے آئیں گے لہٰذا وہ اس کو کھلی رکھیں. چنانچہ میں نے اس کو ایک کھلی الماری میں رکھ دیا تھا جو برآمدے میں رکھی ہوئی تھی۔

سوال:۔ ناقد کہتے ہیں کہ وہ اتنے بڑے جاگیردار تھے کہ ان کی زمین پر چار ریلوے اسٹیشن واقع تھے۔

جواب:۔ یہ صحیح ہے. لیکن اب نہیں! یہ ان کے والد کے زمانے میں تھا. لیکن زرعی اصلاحات کے بعد وہ اپنی چالیس ہزار ایکڑ زمین سے دستبردار ہو گئے تھے۔ جیکب آباد میں ان کی زمین پر ایک بہت خوبصورت مکان تھا جس کو وہ چاہتے تو رکھ سکتے تھے. لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ مکان بھی انہوں نے غریب ہاریوں کو دے دیا۔ انہوں نے کبھی پیسے کی پرواہ نہیں کی۔

سوال:۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ جیل میں سارا کھیل اس یقین پر کھیل رہے تھے کہ ضیاء ان کو سزائے موت دینے کی جرأت ہرگز نہیں کرے گا؟

جواب:۔ یہ غلط ہے؟ جب وہ پہلی بار جیل گئے تھے تو انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ ان کو پھانسی دی جائے گی کیونکہ ضیاء جانتا تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ دوبارہ برسر اقتدار آ جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ میں اب بھی ان کی زندگی بچانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے اس کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ ضیاء انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ جب عدالت نے ان کے لئے سزائے موت کا حکم سنایا تو میں نے ان سے کہا کہ میں رحم کی درخواست کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا "اگر تم ایسا کرو گی اور ضیاء نے مجھے چھوڑ دیا تو میں عوام کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو خود ہی ختم کر لوں گا۔

www.bhutto.org

سوال:۔ انہوں نے جیل میں آخری ملاقات پر کیا بات کی تھی؟

جواب:۔ جب انہوں نے مجھے اور بے نظیر کو ایک ساتھ دیکھا تو کہا "اچھا تو آج تم دونوں آئی ہو" کیونکہ اس سے قبل ہم کو ایک ساتھ ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ انہوں نے جیل کے ایک محافظ کو بلایا اور اسے جیل سپرنٹنڈنٹ کو بلانے کو کہا۔ جب وہ آگیا تو مسٹر بھٹو نے اس سے دریافت کیا۔ "گویا کالی کتاب پہنچ گئی ہے" یہ بالکل وہی جملہ ہے جو انہوں نے بولا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا "جی جناب!" پھر مسٹر بھٹو نے کہا "اوہ! تو پھر مجھے شیو کرنا چاہئے، غسل بھی کرنا چاہئے اور کپڑے بھی تبدیل کرنا چاہئیں۔" اس کے بعد انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے پھانسی کے وقت کے متعلق دریافت کیا "صبح پانچ بجے" سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا انہوں نے یہ سب باتیں ہمارے سامنے کیں لیکن یہ نہیں چاہا کہ ہم جیل کے عملے کے سامنے روئیں اس لئے ہم نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

سوال:۔ ان کی مرغوب غذا کیا تھی؟

جواب:۔ ان کا مرغوب کھانا قیمہ، دال، اچار اور چٹنی تھا۔

سوال:۔ وہ سب سے زیادہ نفرت کس چیز سے کرتے تھے؟

جواب:۔ جب کوئی شخص ان کا یا ان کے خاندان کا مذاق اڑاتا تھا، یا بے عزتی کرتا تھا۔

سوال:۔ کیا وہ ایک موڈی آدمی تھے؟

جواب:۔ جی نہیں! وہ بہت سنجیدہ انسان تھے۔

سوال:۔ آپ سیاست میں کس طرح آئیں؟

جواب:۔ ان سے خواتین کی بھی کافی تعداد ملنے آتی تھی لیکن ان کے پاس ان سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا تھا اور وہ مجھے ان سے ملنے کو کہہ دیا کرتے تھے۔ بعد میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں پارٹی کے شعبہ خواتین کو منظم کروں اور اس طرح میں خواتین کی شاخ کی سربراہ بن گئی۔

سوال:۔ آپ کا ساتھ دورِ حاضر کے عظیم انسان سے رہا ہے۔ آپ کے خیال میں ایک اچھے انسان میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔

جواب:۔ ہمدردی، سچائی اور صاف گوئی ایک اچھے انسان کے اوصاف ہونا چاہئیں اور یہی تعلیم انہوں نے اپنے بچوں کو دی۔

سوال:۔ وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ کس کو پیار کرتے تھے؟

www.bhutto.org

جواب:۔ وہ صنم کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی، لیکن دوسرے بچوں کی طرح دراز قد نہیں تھی بلکہ پستہ قد تھی اور بچپن ہی سے اس کی نظر کمزور تھی لہٰذا وہ اس کی طرف زیادہ مائل نظر آتے تھے. اور وہ بھی ان سے بہت زیادہ مانوس تھی۔

سوال:۔ کیا وہ آپ کو تحائف بھی دیا کرتے تھے؟

جواب:۔ جی ہاں! وہ مجھے تحفے دینے میں بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ پہلے وہ میرے لئے عطریات (Perfumes) خریدتے تھے۔ ایک مرتبہ خوشبویات کی بوتلوں کا ایک پورا سیٹ میرے لئے خرید لائے جس کی قیمت ہزاروں روپے بنتی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اس سے بہتر تھا اگر وہ اتنی ہی قیمت کے میرے لئے زیورات لے آتے۔ اس کے بعد انہوں نے میرے لئے زیوارت اور گھڑیاں خریدنا شروع کر دیں۔

وہ میری اور بچوں کی سالگرہ کی تاریخ ہمیشہ یاد رکھتے تھے اور ان مواقع پر وہ ہم کو اپنے پاس بلانا نہیں بھولتے تھے خواہ وہ غیر ممالک میں ہی کیوں نہ ہوں۔

سوال:۔ وہ خود کیا پہنتے تھے؟

جواب:۔ وہ اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہننا پسند کرتے تھے۔ وہ اپنی ریشمی قمیص. جرابوں اور جوتوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ خوبصورت سوٹ زیب تن کرتے تھے لیکن وہ کبھی غیر ممالک میں نہیں سلواتے تھے بلکہ زیادہ تر "حامد ٹیلرز" سے سلواتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کو سلا ہوا سوٹ خریدنے کا مشورہ دیا۔ وہ انہوں نے خرید تو لیا لیکن بعد میں حامد ٹیلرز سے رد و بدل کرائی۔ گہرا سرمئی اور نیلا ان کا پسندیدہ رنگ تھا۔ ان کا دل پسند پرفیوم "شالیمار" تھا۔

سوال:۔ ہر بیوی کو اپنے شوہر سے کچھ شکایتیں ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو بھی تھیں؟

جواب:۔ اب تو ایسا نہیں ہے۔ ہاں پہلے کبھی ایسا ہوتا تھا۔ جب وہ ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے یا لڑکیاں ان کے پیچھے لگی ہوتی تھیں کیونکہ وہ ایک پر کشش شخصیت تھے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۷ء تک ایک ساتھ گزارا۔ ہم نے اپنی سالگرہ کی پچیسویں سالگرہ ان کی گرفتاری سے کچھ عرصہ قبل منائی تھی۔ اس موقعہ پر انہوں نے مجھے ایک خوبصورت ہیرے کی انگوٹھی تحفہ میں دی تھی. بعد میں ان کو مار ڈالا گیا۔

سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے ضیاء کو فوج کا سربراہ بنانے سے قبل کسی سے مشورہ نہیں کیا۔

www.bhutto.org

جواب:۔ یہ بات غلط ہے، انہوں نے کئی جنرلوں سے مشورہ کیا تھا۔ جنرل ٹکا خان نے مشورہ دیا تھا کہ ضیاء ایک ایکٹر ہے. اور ہمیشہ اپنی اصلیت اور باطن چھپاتا ہے۔ خفیہ محکمہ کے سربراہ جنرل جیلانی کا مشورہ تھا کہ ضیاء اس عہدے کے لئے موزوں ہے اور اس کے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں، چنانچہ مسٹر بھٹو نے جنرل جیلانی کے مشورہ پر عمل کیا۔

سوال:۔ آخری ملاقات میں مسٹر بھٹو نے آپ سے کیا باتیں کی تھیں؟

جواب:۔ انہوں نے کہا تھا کہ اپنی دانست میں انہوں نے بہترین کام کیا ہے اور انہیں کوئی ندامت اور شرمندگی نہیں ہے۔ وہ ایک صاف ضمیر کے ساتھ اپنے رب کے پاس جائیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے ان کو ہلاک کر دیا۔ میں جانتی ہوں کہ انہیں پھانسی پر نہیں لٹکایا گیا بلکہ قتل کیا گیا ہے۔ میں ان سے اتفاق نہیں کرتی چاہے وہ کوئی بھی ہوں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ان کو پھانسی دی گئی تھی۔ جیل کے ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ مسٹر بھٹو کو قتل کیا گیا تھا۔

سوال:۔ مسٹر بھٹو آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کرتے تھے؟

جواب:۔ وہ مجھے "نصراتم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ فارسی میں اس کا مطلب ہے "میری نصرت۔"

www.bhutto.org

ہمیشہ خوش باش

امیر بیگم

ہم دونوں نے اپنا بچپن ایک ساتھ گزارا۔ جب میں ۲۵ سال کی تھی تو شہید بھٹو کے ساتھ میری شادی ہو گئی، اور یہ سب کچھ ہمارے گاؤں "میر پور بھٹو" میں خاندانی طور طریق اور روایات کے مطابق ہوا، اور جہاں میرے والد جو شہید بھٹو کے چچا زاد تھے رہائش پذیر تھے۔ اس کے بعد ہم بمبئی چلے گئے جہاں بھٹو صاحب زیر تعلیم تھے اور پھر قیام پاکستان کے بعد واپس آ گئے۔ مجھے وہاں سے واپسی کی صحیح تاریخ یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم وہاں تین سال ٹھہرے تھے۔ غالباً وہ ۱۹۴۴ء تھا جب میں اپنے گاؤں سے بمبئی گئی تھی۔ جس وقت میری اور بھٹو صاحب کی منگنی ہوئی تھی میرے اور ان کے والد حیات تھے اور بھٹو صاحب حصول تعلیم کے لئے لندن چلے گئے تھے۔ اگرچہ میرے والدین میری اور ان کی عمر میں نمایاں تضاد کو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن میرے سسرال والے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب کچھ ایک خاندانی مسئلہ ہے۔ میں اچھی طرح نہیں جانتی کہ شہید بھٹو کب پاکستان واپس آئے۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ بیرون ملک سے واپسی پر انہوں نے "سندھ مسلم لاء کالج" میں تدریس کا کام شروع کر دیا تھا، اور میں اپنے گاؤں میں رہتی تھی۔ وکالت کے پیشے سے منسلک ہونے کے بعد وہ اکثر اپنے گاؤں نوڈیرو آتے رہتے تھے، اور میرے پاس ان کی بلند خیالی کی تعریف اور توصیف میں کہنے کو بہت کچھ

www.bhutto.org

تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لگی ہوئی جناح صاحب کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے اکثر کہا کرتے تھے کہ ان کی خواہش ہے کہ وہ حصول تعلیم کے بعد جناح صاحب کے پائے کے قائد بن سکیں۔ اگرچہ ان کی والدہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ غیر ممالک میں رہیں لیکن وہ اپنے مقصد حیات کی تکمیل کے لئے پوری توجہ اور تندہی سے مصروف تھے اور اس بات سے اس عمر میں ان کی قوت ارادی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے غم اور خوشی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ وہ میری بہت عزت کرتے تھے اور مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ ہم دونوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اکثر دوسری شادی کا ذکر بھی کرتے تھے کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں خاندانی روایت کے مطابق برقعہ اتار کر ان کے ساتھ آ جا نہیں سکتی تھی، لیکن ساتھ ہی وہ یہ وعدہ بھی کرتے تھے کہ وہ اپنی وہ ذمہ داریاں پوری طرح نبھائیں گے جو میرے لئے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ دوسری شادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کریں گے۔ وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں اپنے گاؤں کے مسائل خود ہی حل کر لیا کروں۔ شہید بھٹو عیدین کے موقعہ پر نوڈیرو اکثر آتے تھے۔

سوال:۔ کیا آپ بھٹو صاحب کے ساتھ کسی جگہ گئیں؟

جواب:۔ نہیں! میں کبھی نہیں گئی۔ میں گھر پر ہی رہنے کو ترجیح دیتی تھی۔ ایک مرتبہ بھٹو صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں بھی اس تقریب میں شرکت کروں گی، لیکن معشوق بھٹو نے جو ممتاز علی بھٹو کے بھائی تھے لوگوں کو بتا دیا کہ "بھٹو صاحب کی بیگم تقریب میں شریک نہیں ہو سکیں گی کیونکہ وہ عوام میں آنا پسند نہیں کرتیں۔" مجھے کراچی میں بھی کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی لاڑکانہ میں اگر میں لاڑکانہ میں بغیر برقعہ بھی گزر جاؤں تو مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا کیونکہ وہاں کسی نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

سوال:۔ کیا بھٹو صاحب نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ دوسری شادی کریں گے؟

جواب:۔ جی ہاں!

سوال:۔ کیا انہوں نے بیگم نصرت بھٹو سے شادی کی اطلاع آپ کو دی تھی؟

جواب:۔ نہیں!

سوال:۔ پھر آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا؟

جواب:۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے جس پر کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہم لوگ کراچی

www.bhutto.org

اپنے ایک ایرانی دوست سے ملنے گئے لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہاں ہمیں بتایا گیا کہ وہ سب ایک ایرانی لڑکی کی منگنی میں گئے ہوئے ہیں جو ایک سندھی لڑکے کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اور وہ لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ خود بھٹو صاحب تھے۔ اس وقت میری بہن اور منہ بولی ماں بھی موجود تھیں۔ میرے سسر میرے والد سے ملنے وہاں آئے لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو ہم نے ان کو واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ فوراً میرے سسر سے ملنے وہاں گئے جہاں میرے چچا نے ان کو بھٹو صاحب کی منگنی کے بارے میں بتایا تھا۔ بھٹو صاحب منگنی کے دوسرے دن شام کو میرے پاس آئے۔

سوال:۔ کیا اس بات پر بھٹو صاحب سے آپ کا جھگڑا ہوا؟

جواب:۔ جی نہیں! میرے والد نے مجھ سے دریافت کیا کہ ذوالفقار نے مجھے اس شادی کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ تب میرے والد نے مجھے بھٹو صاحب کی ایک ایرانی لڑکی کے ساتھ شادی کی اطلاع دی۔ اس کے بعد میرے والد نے بھٹو صاحب اور نصرت کو کراچی کے ایک کلب میں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

سوال:۔ بھٹو صاحب کے بچوں میں آپ سب سے زیادہ کس کو پسند کرتی ہیں؟

جواب:۔ مجھے سب بچے بہت عزیز ہیں۔ بھٹو صاحب ہر عید پر ان کو گاؤں لاتے تھے۔ ہمارے یہاں کئی گھوڑے تھے اور وہ ان پر سواری سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں ان کے لئے مٹھائیاں تیار کرتی تھی بھٹو صاحب اپنے بچوں کو بتاتے تھے کہ میں ان کی پہلی والدہ ہوں اور ان سب کو میری عزت کرنا چاہئے۔ بے نظیر اور دوسرے بچے میرا بڑا احترام اور مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔

سوال:۔ بمبئی میں بھٹو صاحب کی کیا مصروفیات ہوتی تھیں؟

جواب:۔ وہ پابندی سے اسکول جاتے تھے اور کرکٹ کے بہت شوقین تھے۔ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی مشتاق علی ان کے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے ایک گیند ڈوری سے باندھ کر چھت کے پنکھے کے ساتھ لٹکا رکھی تھی۔ اور لٹکی ہوئی گیند پر بیٹ سے کرکٹ کے انداز میں ضرب لگا کر مشق کیا کرتے تھے۔

سوال:۔ کیا بھٹو صاحب غصیلے آدمی تھے؟

جواب:۔ نہیں ہرگز نہیں!

سوال:۔ کیا وہ خوش لباس تھے؟

www.bhutto.org

جواب:۔ جی ہاں وہ اچھے کپڑے پہننے کے بہت شوقین تھے۔

سوال:۔ ان کے دوسرے شوق کیا تھے؟

جواب:۔ وہ ایک بڑا آدمی بننا چاہتے تھے۔
وہ بوسکی (ڈبل گھوڑا سلک) پہننا پسند کرتے تھے وہ ایک دولت مند خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی دادی بمبئی سے ان کو بوسکی بھیجا کرتی تھیں۔
گرمیوں میں وہ مالٹے اور سردیوں میں انار بہت شوق سے کھاتے تھے۔

سوال:۔ کیا آپ نے بھٹو صاحب کی والدہ کو دیکھا تھا؟

جواب:۔ جی ہاں! میں تین سال تک ان کے ساتھ بمبئی میں رہی۔ شادی سے پہلے بھی ہم ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے اور بھٹو صاحب بھی ہمارے گھر آتے تھے۔

سوال:۔ ان کا انتقال کب ہوا؟

جواب:۔ ہماری شادی کے بعد!

سوال:۔ وہ کس قسم کی خاتون تھیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا؟

جواب:۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنی ساس سے ان کی زندگی کے متعلق پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

سوال:۔ گویا بھٹو صاحب ایک بڑا آدمی بننا چاہتے تھے؟

جواب:۔ جی ہاں! وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں ایک بڑے آدمی کی بیوی ہوں۔

سوال:۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ ان میں بڑا آدمی بننے کی خواہش کس سے متاثر ہو کر پیدا ہوئی تھی؟

جواب:۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔ ہم نے ان کو سیاست میں حصہ لینے سے بہت روکا۔ ایوب خان سے ان کے اختلافات ہو گئے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے..... "میں نے تعلیم اس لئے حاصل نہیں کی کہ بنگلوں میں بیٹھ کر نوکر چاکروں سے فضول باتیں کرتا رہوں۔ میں سیاست کے ذریعہ عوام کی خدمت کروں گا۔"
وہ بڑی امنگ کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں لگی ہوئی جناح صاحب کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے

"میں اس شخص کی طرح بنوں گا اور اپنے عوام کی فلاح اور بہبود کے لئے کام کروں گا۔"

سوال:۔ ان کے صدر اور وزیر اعظم بننے کے بعد بھی اپنے گاؤں میں ہی رہیں؟

www.bhutto.org

جواب:۔ جی ہاں، میں گاؤں میں ہی رہی۔

سوال:۔ کیا آپ قصر صدارت یا کہیں اور ان کے ساتھ گئیں؟

جواب:۔ انہوں نے مجھے اس کے لئے مجبور کیا تھا. لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ میں وہاں اپنے آپ کو تنہا محسوس کروں گی۔

سوال:۔ ان تین سالوں کے متعلق کچھ بتایئے جب آپ بھٹو صاحب کے ساتھ رہیں؟

جواب:۔ جی ہاں! میں بمبئی میں تین سال رہی، لیکن اس کے بعد میں اپنے والد کے گھر رہنے لگی۔ بھٹو صاحب اکثر وہاں آتے رہتے تھے ہم صرف تین سال ساتھ رہے۔

سوال:۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری کے وقت آپ کہاں تھیں؟

جواب:۔ میں لاڑکانہ میں تھی اور ان کو وہیں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ پھر میں کراچی چلی گئی۔ کچھ دن بعد یہ خبر آئی کہ ان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔ وہ عید کے موقعہ پر میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میری دونوں بہنیں اور رضائی ماں بھی ان سے ملیں۔ باہر لوگ نعرے لگا رہے تھے لیکن بھٹو صاحب نے ان کو روک دیا۔

سوال:۔ کیا انہوں نے آپ سے کوئی بات کی؟

جواب:۔ نہیں کوئی زیادہ نہیں۔ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے رہتے تھے۔

سوال:۔ کیا انہوں نے آپ کو سیاست میں آنے سے منع کیا تھا؟

جواب:۔ جی ہاں! انہوں نے رہائی کے لئے اپیل کرنے سے مجھے منع کر دیا تھا۔

سوال:۔ آپ نے جیل میں ان سے کتنی بار ملاقات کی تھی؟

جواب:۔ چار مرتبہ؟

سوال:۔ آپ نے ان سے کیا بات کی؟

جواب:۔ وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔

سوال:۔ آپ نے بھٹو صاحب کو جیل میں کیسا پایا؟

جواب:۔ بھٹو صاحب بڑی دلیری اور بہادری سے صورت حال کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں رونے لگی تو انہوں نے مجھے تسلی دی اور کہا "رومت اپنے خاندان کی طرف دیکھو۔ رو نہیں، وہ تم کو روتے ہوئے دیکھیں گے تو مذاق اڑائیں گے کہ بھٹو کی بیوی رو رہی ہے۔"

ضیاء نے خفیہ طور پر جیل میں ان کے کمرے کے اندر جاسوسی آلات لگوا دیئے تھے تاکہ وہ ان کی گفتگو سن سکے اس لئے ہم نے زیادہ بات چیت نہیں کی۔

www.bhutto.org

سوال:۔ راولپنڈی جیل میں ان سے آخری ملاقات کے موقعہ پر کیا واقعات ہوئے تھے؟

جواب:۔ ہم کو وہاں سخت حفاظت میں لے جایا گیا۔ ہم کو دروازے پر کھڑا کر دیا گیا تھا اور بھٹو صاحب سلاخوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان کو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا۔ ان کا بستر زمین پر بچھا ہوا تھا اور ان کے پاس صرف ایک کمبل تھا۔ اس کے علاوہ لکڑی کا ایک کموڈ، اور پانی کے لئے پلاسٹک کی بالٹی تھی۔ ان کی بہن جنہوں نے ان کی پرورش کی تھی اور ان کا بھتیجا بھی اس موقعہ پر موجود تھے۔ لیکن ملاقات کا وقت بہت کم تھا۔ ہم ان سے آخری مرتبہ ۳۰ یا ۳۱ر مارچ کو ملے تھے۔ ملاقات سے قبل ہماری بڑی سخت تلاشی لی گئی تھی۔ وہاں سے پھر ہم روہڑی آ گئے۔ پھر وہاں سے اپنی گاڑی میں سوار ہو کر نوڈیرو روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہمارے ڈرائیور نے بتایا کہ پولیس اور فوج نے ہمارے نوڈیرو والے گھر پر چھاپہ مارا تھا اور گھر کی تلاشی لی تھی۔ ہماری آخری ملاقات کے چار دن بعد ان کو پھانسی دے دی گئی۔

سوال:۔ وہ آپ کے گھر کیا تلاش کرنے آئے تھے؟

جواب:۔ مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے اس صندوق پر قبضہ کر لیا تھا جس میں ہماری زمین کی دستاویزات تھیں۔

سوال:۔ کیا وہ اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے گئے تھے؟

جواب:۔ نہیں! وہ کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے کیونکہ ان کی مطلوبہ کوئی چیز وہاں موجود نہیں تھی۔

سوال:۔ بھٹو صاحب کو آپ نے کیسا انسان پایا؟

جواب:۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی میں غصے میں ان پر تنقید بھی کر دیا کرتی تھی لیکن وہ ہنس پڑتے تھے اور کہتے تھے "میں جو ہوں سو ہوں" وہ بہترین آدمی تھے۔ میں ان سے کہا کرتی تھی "آپ عوام کے لئے وزیراعظم بن جائیں لیکن ہمارے لئے ذوالفقار ہی رہیں گے۔" وہ ہمیشہ بڑوں کا احترام کرتے تھے۔ وہ میری رضائی ماں کی بھی بہت عزت کرتے تھے۔

سوال:۔ کیا آپ دونوں میں کبھی جھگڑا ہوا؟

جواب:۔ نہیں کبھی نہیں! میں جھوٹ کیوں بولوں۔ کبھی کبھار میرا ان سے جھگڑا ہو جاتا تھا اور میں ان سے کہتی تھی "آپ مجھ سے راز داری کرتے ہیں" وہ جواب دیتے تھے "تم میری بیوی ہو مجھ سے لڑا نہ کرو۔"

www.bhutto.org

سوال:۔ کیا آپ کبھی ان کے دوستوں کے سامنے ہوئیں؟

جواب:۔ نہیں کبھی نہیں! ہم سخت پردہ کرتے تھے۔

سوال:۔ کیا آپ کے خاندان میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت ہے؟

جواب:۔ جی ہاں! اولاد کے حصول کے لئے۔ بھٹو صاحب نے سیاست اختیار کر لی تھی اور ان کو ایک تعلیم یافتہ شریک حیات کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ ہر جگہ جا سکے۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اسکول جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف قرآن پڑھایا جاتا تھا، لیکن اب لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

سوال:۔ کیا آپ کبھی اسکول گئیں؟

جواب:۔ نہیں!

سوال:۔ جب ۴ر اپریل کو بھٹو صاحب کی میت لائی گئی تھی تو کیا آپ کو بلوایا گیا تھا؟

جواب:۔ ضیاء نے ہدایات جاری کی تھیں کہ گڑھی خدا بخش میں بھٹو کی پہلی بیوی کو بھٹو کی میت ایک نظر دیکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ (روتے ہوئے) ہم ساری رات قرآن پاک اور درود پڑھتے رہے کہ یکایک منشی نذیر محمد کا لڑکا چیختا ہوا آیا "یا حسین! یا حسین!" پہلے میں سمجھی کہ شاید باہر کوئی جھگڑا ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے؟ میری ماں نے کہا کہ بھٹو صاحب کے لئے کفن لاؤ ـــــ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ہم پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور میں نے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو۔ میں جب وہاں پہنچی تو وہاں تقریباً چار سو فوجی موجود تھے۔ اس وقت ہم بے پردہ، ننگے پاؤں اور ننگے سر تھے۔ وہ لمحہ ہمارے لئے کربلا کی طرح تھا۔ ہم بھٹو صاحب کی میت دیکھنے کے لئے ایک بھاری فوجی دستے کی موجودگی میں وہاں پہنچے۔ انہوں نے ہمیں پوری میت دیکھنے کی اجازت نہیں دی حتیٰ کہ ہمیں غسل اور کفن دینے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ ضیاء نے ان ملاؤں کو بھی مروا دیا جنہوں نے بھٹو صاحب کی میت کو غسل دیا تھا، اور پھانسی دینے والے جلاد کو بھی مروا دیا گیا۔

سوال:۔ کیا آپ کو صرف چہرہ دیکھنے کی اجازت دی گئی تھی؟

جواب:۔ میں اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ میں نے ان کو چھاتی تک دیکھا تھا۔ میری بہن اختر نے ان کی میت دیکھی تھی اور بتایا تھا کہ اس پر تشدد کے نشانات موجود تھے۔

سوال:۔ آپ نے بھٹو صاحب کو سب سے زیادہ خوش کب دیکھا تھا؟

جواب:۔ وہ ہمیشہ ہی خوش و خرم رہتے تھے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

بہن کی زبانی

مسز منور الاسلام

میں نے اکثر یہ سنا ہے کہ میرے بھائی شہید ذوالفقار علی بھٹو ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ لوگ یا تو ان سے محبت کرتے یا پھر نفرت۔ شاید میں وہ واحد فرد ہوں جو ان کو بہت بہتر طریقہ پر جانتی ہوں کیونکہ ہم دونوں ایک ساتھ پلے اور بڑھے تھے۔ ہمارے بچپن سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے والد کی طویل غیر حاضری تھی جو گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انگلینڈ میں تھے۔ ان دنوں ہم صرف ایک ڈاکو کے قصے سنا کرتے تھے ہمارے ملازمین ہم کو اس ڈاکو کی دلیری اور سفاکی کی داستانیں سناتے تھے۔ اس وقت ہماری بہن "بے نظیر" بہت چھوٹی تھی زلفی اور میں اس ڈاکو کی کہانی بڑی دلچسپی سے سنتے تھے کہ اس کو کسی طرح علاقہ کے وڈیرے نے گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا۔ بہرحال جب رات ہونے لگی تو ہم خوفزدہ تھے۔ ہمارا مکان تین منزلہ تھا دوسری سے تیسری منزل پر جانے کے لئے ایک زینہ تھا۔ جہاں گرمیوں میں ہسپانوی طرز کے صحن میں سوتے تھے۔ اس رات میں نے اور زلفی نے سیڑھیوں پر ملازم کو آواز دی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ سب موجود ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو گئے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے۔ ہم اپنے بڑے سے سبزہ زار میں کھیلتے تھے اور خرگوشوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ وہ خوشیوں اور بے فکری کے دن تھے۔ دن گزر رہے تھے

www.bhutto.org

اور ہم کو بمبئی جانا تھا جہاں ہمارے والد کو سندھ کی نمائندگی کرنا تھی۔ اس وقت سندھ بمبئی سے منسلک تھا۔ ہمیں بحری سفر میں بہت لطف آیا۔ ہم نے جہاز کی خوب سیر کی اور ہم سفر بچوں سے دوستی پیدا کر لی۔

والد کو چھ ماہ بمبئی اور چھ ماہ پونا میں رہنا ہوتا تھا۔ پونا کی آب و ہوا بہت بہتر تھی۔ میں اور میری بہن ممتاز "کونوینٹ جیسس اینڈ میری" (Convent Jesus and Mary) اسکول کے بورڈنگ میں داخل کر دیئے گئے تھے۔ زلفی کی صحت ٹھیک نہیں تھی اس لئے اس کو دن کے اسکول "سینٹ میری" میں داخل کیا گیا اور وہ والدین کے ساتھ بمبئی آ گیا۔ پونا میں قیام کے دوران ہم ہفتہ وار چھٹی پر بمبئی جاتے تھے۔ زلفی وقت سے پہلے ہی پہنچ کر کار میں ہمارا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کہا کہ وہ ہم کو حیرت زدہ کر دے گا، اور پھر وہ اپنی بائیسکل لے آیا جو اس نے چلانا سیکھ لی تھی۔ پونا میں اکثر ثقافتی سرگرمیاں ہوتی رہتی تھیں اور ہمارے والدین کو ان میں شرکت کرنی ہوتی تھی۔ ہم تینوں فلم دیکھنے چلے جاتے تھے۔ ہم کو تانگہ کی سواری میں بہت لطف آتا تھا۔ ہم اکثر دو تانگے کرائے پر لیتے تھے اور ہمارا ملازم ہمارے ساتھ ہوتا تھا دونوں تانگوں کی دوڑ لگتی تھی اور وہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ سینما چھاؤنی میں ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اب تک ایک فلم کا نام یاد ہے "دی تھرٹی نائن اسٹیپس" (The 39 Steps) جس کا اداکار رابرٹ ڈوناٹ تھا جو ہمارا پسندیدہ اداکار بن گیا تھا۔ پھر ہم کو جو بھی جیب خرچ ملتا تھا اس سے ہم وہ فلمی رسالے خرید لیتے تھے جن میں "رابرٹ ڈوناٹ" کی تصاویر ہوتی تھیں، اور پھر ہمارے درمیان اس کی زیادہ سے زیادہ تصاویر جمع کرنے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ اس کے اگلے سال ہم نے ایک اور فلم "دی سکارلٹ ٹانگہ" (The Scarlet Tonga) دیکھی اور پھر ڈوناٹ کو بھول کر اسکارلٹ ٹانگہ سے متعلق رسالے خریدنا شروع کر دیئے۔ ایک ہفتہ وار چھٹی ہم نے کھنڈالہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر پارپیا (Mr. Parpia) کے ساتھ گزاری۔ وہ ہم کو "ایکھو پوائنٹ" (Echo Point) تک پیدل لے گئے۔ جب اندھیرا ہونے لگا تو ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم راستہ جانتے ہیں، لیکن کھنڈالہ ایک پہاڑی مقام ہے جو چاروں طرف بلند اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا ہے اور کئی گلیاں ادھر ادھر گھومتی ہیں۔ زلفی اور میری چھوٹی بہن بے نظیر آگے آگے چل رہی تھے۔ یکایک وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ والدہ بہت فکر مند ہو گئیں۔ لیکن مسٹر پارپیا نے خیال ظاہر کیا کہ وہ دونوں گھر پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب وہ گھر پر بھی نہیں ملے تو مسٹر اور مسز پارپیا بھی فکر مند اور پریشان ہو گئے، لیکن انہوں نے والدہ کو تسلی دی اور یقین دلایا کہ تلاش کے لئے آدمی بھیج دیئے گئے ہیں۔ اس

www.bhutto.org

دوران ہم سب بہت گھبرا گئے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ دونوں مل گئے۔ دراصل وہ دوسرے راستے پر نکل گئے تھے اور بازار پہنچ گئے تھے۔ مسٹر پارپیا نے زلفی سے دریافت کیا کہ اسے اس گھنے جنگل میں ڈر نہیں لگا جہاں بندر بھی سڑک پر آ بیٹھتے ہیں۔ زلفی نے جواب دیا کہ وہ ایسی کسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوا۔ اس کو یاد تھا کہ ایسے مواقع پر والدہ پیر دستگیر کو یاد کرتی تھیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ ممتاز اور میں کرسمس کی چھٹیاں گزارنے بمبئی چلے گئے۔ وہاں زلفی ہم کو اپنی پسندیدہ دوکانوں پر لے گیا۔ اس وقت انگریز کی حکومت تھی۔ دوکانوں پر طرح طرح کا سامان بھرا ہوتا تھا۔ خاص طور پر مختلف اقسام کے چاکلیٹ، بسکٹوں کے ڈبے، کھلونے اور کرسمس سے متعلق اشیاء مثلاً غباروں سے بھرے ہوئے ڈبے اور چہرے کے نقاب وغیرہ۔ زلفی کی دل پسند کہانی "ہیاواتھا" (HIAWATHA) تھی، جس کو ممتاز کی زبانی سن کر اس کا دل کبھی نہیں بھرتا تھا۔ وہ اس کو "اسکارلٹ پمپرنیل" (Scarlet Pimpernel) کی کہانیاں بھی سناتی تھیں۔

جب سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا تو ہم کراچی آ گئے اور ہم سب اسکول جانے لگے۔ ہم کلب روڈ پر رہتے تھے اور ہمارا مکان "ہورڈلے ہاؤس" (Hordley House) کہلاتا تھا اور ابھی تک وہاں موجود ہے۔ میں اب بھی اکثر وہاں جاتی ہوں اور مجھے وہاں گزرے ہوئے خوشی کے دن یاد آ جاتے ہیں۔

ہم ایک بار پھر بمبئی آ گئے۔ میرے والد نے پوری ایمانداری اور تندہی سے سندھ کی خدمت کی تھی۔ یہ ان کی خدمات کا صلہ تھا کہ انہوں نے آخری انتخاب کے علاوہ کوئی انتخاب نہیں ہارا۔ بعد میں انہوں نے "پبلک سروس کمیشن" میں سندھ کے نمائندے کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا فیصلہ کیا۔ زلفی اب کیتھیڈرل ہائی اسکول میں تھا۔ کرکٹ کا کھیل اس کی کمزوری تھا۔ پہلے وہ اسکول کی جونیئر اور پھر سینئر ٹیم میں کھیلنے لگا۔ وہ اس وقت کے مشہور کھلاڑیوں مثلاً کاردار اور امرناتھ کا بڑا دلدادہ تھا، لیکن سب سے زیادہ وہ مشتاق علی کو پسند کرتا تھا۔ اگرچہ ان دونوں کی عمریں کافی فرق تھا لیکن پھر بھی اس نے ان سے دوستانہ مراسم پیدا کر لئے تھے۔ زلفی کے بچپن کے دوستوں میں ایک عمر قریشی ہیں جو آخری دم تک دوست رہے۔ وہ دھن راج محل میں رہتے تھے اور وہاں کرکٹ اور دیگر کھیلوں کے کھلاڑی جمع ہوتے تھے۔ زلفی کی اکثر شامیں وہیں گزرتی تھیں۔

اپنے اسکول کے آخری سال کے دوران زلفی ثریا نام کی ایک لڑکی کی زلفوں کا شکار ہو گیا۔ وہ ہر روز اس کو ایک مقررہ وقت پر فون کرتا تھا اور برکلے کالج امریکہ میں تعلیم کے لئے

www.bhutto.org

جانے پر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس لڑکی کو فون کرتی رہوں۔ وہ اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کو سیاست سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ پنڈت نہرو کی چھوٹی بہن مسز کرشنا ہوتی سنگھ ہماری پڑوسن تھیں۔ پنڈت نہرو جب بمبئی آتے تو ان کے یہاں قیام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب پنڈت نہرو وہاں آئے تو زلفی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ان سے ضرور ملاقات کرے گا۔ یہ کام مشکل نہیں تھا۔ ہمارے اور ان کے گھر کے درمیان ایک نیچی دیوار تھی۔ جس کے دونوں طرف ہم بڑی آسانی سے گاندھی لباس میں ملبوس سینکڑوں لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ رہے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے سے زلفی بھی وہاں داخل ہو گیا۔ وہ ایک نوجوان طالب علم تھا اور کانگریسی لباس بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ پنڈت جی نے اسے بڑے غور سے دیکھا اور اپنے پاس بلایا۔ پنڈت جی نے زلفی سے اس کا نام دریافت کیا، اور یہ کہ وہ پاکستان کے متعلق کیا نظریہ رکھتا ہے۔

زلفی ایک کٹر پاکستانی تھا۔ پنڈت جی نے اس سے کہا کہ نوجوان عام طور پر جذباتی ہوتے ہیں۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور وہ مزید بڑھے گا اور اس کو اس (زلفی) جیسے نوجوان کی ضرورت ہے۔

زلفی نے کئی بار قائداعظم سے ملنے کی کوشش کی جو مالا بار ہلز پر رہتے تھے، لیکن بدقسمتی سے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ جناح صاحب کی رہائش گاہ کے پٹھان چوکیدار نے اس کو اندر نہیں جانے دیا اور کہا کہ وہ اس وقت اندر جانے کی اجازت دے گا جب جناح صاحب موجود ہوں گے، لیکن زلفی نے جب بھی ان سے ملنے کی کوشش کی وہ بمبئی سے باہر ہوتے تھے۔ بہرحال اس کی ملاقات مس جناح سے ہو گئی، اور بعد میں زلفی نے کئی سال بعد ان کو اس ملاقات کی یاد دلائی۔ جب وہ "موہاٹہ پیلس" میں رہتی تھیں۔

ممتاز کی شادی ہو چکی تھی اور وہ حیدر آباد دکن میں رہ رہی تھی۔ اور اب کمبالہ والے مکان میں زلفی۔ میں اور والدہ رہ گئے تھے والد جوناگڑھ میں تھے اور زلفی اپنے موسم سرما کے کپڑے اور دیگر اشیاء کی خرید میں مصروف رہتا۔ خریداری میں زلفی اور اس کے جگری دوست جہانگیر مگاسیٹھ کے ساتھ میں بھی ہوتی تھی۔ سفری سامان کی دکان پر میں نے ایک سفری کیس پہلی مرتبہ دیکھا اور اسے اٹھالیا۔ زلفی نے مجھے ایسا کرتے دیکھ لیا۔ اور اسے رکھ لینے کو کہا اور یہ کہ اس کی قیمت بیگیج کی مد سے ادا کر دی جائے گی۔

زلفی کا پسندیدہ ریسٹورینٹ "دی پرشین ڈائری" (The Pevsian Diary) تھا اور ہم ہر خریداری کے اختتام پر اس ریسٹورینٹ میں ضرور جاتے تھے۔

www.bhutto.org

زلفی، امی اور میں اپنی سب سے چھوٹی بہن کی قبر پر جانے کے لئے پونا روانہ ہو گئے۔ ہم ہر ماہ ایک بار پونا ضرور جاتے تھے۔ کئی سال بعد تک جب بھی کسی سرکاری دورے پر ہندوستان جاتے تو پونا میں "یاسین جوگ" ضرور جاتے تھے۔

زلفی کی روانگی کا وقت آ گیا۔ امی اور میں غمزدہ دل کے ساتھ اسے کو بمبئی کے سانتا کروز ہوائی اڈے پر الوداع کہنے گئے۔

زلفی کی روانگی کے بعد امی سمندر کے راستے کراچی چلی گئیں کیونکہ ہمارے ساتھ سامان بہت زیادہ تھا۔ میں ایک دن قبل ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ گئی اور لیڈی ہدایت اللہ کے گھر قیام کیا۔ اور جب امی بھی وہاں پہنچ گئیں تو ہم ہر صبح مکان کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ ہم کو ایک موزوں مکان، میک نیل، روڈ پر مل گیا۔ جب زلفی گرمیوں کی چھٹیوں میں واپس آئے تو ہم اس مکان میں تھے زلفی ہر سال گرمی میں وطن واپس آ جاتے تھے۔ بیرون ملک رہنے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کی کمی بہت محسوس کرتے تھے۔ کراچی میں بھی ان کی کوئی سماجی سرگرمیاں نہیں تھیں۔ اس لئے وہ زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزارتے تھے اور امی کے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کے مرغوب کھانے مرغ یخنی، سندھی طریقہ پر تلے ہوئے آلو اور گاجر کا حلوہ تھے۔

میں ابا جان اور زلفی کے درمیان ہونے والی دلچسپ اور عاقلانہ گفتگو سنتی رہتی تھی۔ ابا جان ایک قدامت پسند آدمی تھے اور انہوں نے جاگیردارانہ انداز اور ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن مطالعہ، بیرون ملک سفر اور قیام نے ان کو دوسرے جاگیرداروں کے مقابلے میں ذرا آزاد خیال بنا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ذہنی طور پر جاگیردارانہ نظام کے حامی تھے۔ زلفی کے خیالات اشتراکی تھے۔ وہ عوام کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک ایسا مستقبل تھا جس میں ہر ایک کے ساتھ انصاف ہو اور برابر کے مواقع میسر ہوں۔ اس نے اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار ایک کتابچہ چھپوا کر کیا تھا۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اس کی کوئی نقل موجود نہیں ہے۔

جب زلفی آکسفورڈ میں اپنی تعلیم کے آخری دنوں میں تھے، ان کی ملاقات نصرت سے ہوئی جو مجھ سے ملنے آتی تھی۔ اس کے بعد وہ دوسرے مواقع پر بھی ملتے رہے اور پھر انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ابا جان نے انہیں وطن واپسی تک انتظار کرنے کو کہا۔ لیکن زلفی اور نصرت نے شادی کو ترجیح دی اور شادی کرنے کے بعد دونوں لندن چلے گئے۔

مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک مرتبہ جب زلفی چھٹیوں میں آئے ہوئے تھے۔ ہمارے مالی قاسم کو سانپ نے ڈس لیا۔ والدہ نے مجھے جوناگڑھ ہاؤس فون کر کے ڈرائیور کو بلوانے کو کہا جو وہاں کوارٹر میں رہتا تھا۔ زلفی فوراً اپنے بستر سے باہر آ گئے اور قاسم کو کار میں

www.bhutto.org

جناح ہسپتال لے گئے۔ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ڈرائیور کے آنے تک بہت دیر ہو جائے گی۔ وہ اپنے زیر کفالت لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یار محمد جو ہماری زمین کا منتظم تھا۔ اس کو ایک بڑے آپریشن کی ضرورت پڑ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ آپریشن ڈاکٹر امان اللہ کریں چنانچہ اس کی خواہش کے مطابق اس کا آپریشن ڈاکٹر امان اللہ سے کرا دیا گیا۔ بابو ہمارا بیرا تھا۔ وہ لاڑکانہ کے زمانے سے ہمارے ساتھ تھا اور خدمت کر رہا تھا۔ میرے والد نے اس کی شادی کی اور اس کے چار بیٹوں کو سینٹ اینتھونی اسکول میں تعلیم دلوائی والد کے انتقال کے بعد زلفی نے ان کی تعلیم مکمل کرائی اور پھر ان کو اچھی ملازمت دلوائی۔

اگر میرے بھائی کا اس کے علاوہ کوئی اور روپ تھا تو میں نہیں جانتی۔ میں نے صرف ان کے ناقدوں سے ان کے بارے میں سنا ہے۔ ذاتی طور پر میں بلوچستان میں فوجی کارروائی سے پریشان تھی۔ میں اپنے والد کو اکثر بلوچیوں کا ذکر بڑی عزت اور احترام سے کرتے سنتی تھی۔ والد صاحب کے کئی بلوچی دوست تھے جو سندھ اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں میں رہتے تھے۔ بہرحال زلفی نے یہ بات عدالت عظمی میں بیان دیتے ہوئے کہی تھی کہ وہ بلوچستان سے فوجیں واپس بلانا چاہتے تھے لیکن جنرل ضیاء اس سلسلے میں مزاحمت کر رہا تھا۔

جب زلفی اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس کراچی پہنچے تو والد صاحب نے اپنے ایک دوست "ڈنگو مل رام چندانی" کے ساتھ کام پر لگا دیا۔ جو ایک قانونی مشاورتی ادارہ چلا رہے تھے۔

ان کو اکثر اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کے لئے لاڑکانہ بھی آنا پڑتا تھا۔ انہوں نے زمین کا سب کام تقریباً خود ہی سنبھال لیا تھا کیونکہ والد کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ جب زلفی لاڑکانہ آئے تو ان کی ملاقات اسکندر مرزا سے ہمارے چچا احمد خاں کے مکان پر ہوئی۔ اسکندر مرزا میرے والد کو اچھی طرح جانتے تھے اور اکثر تیتر کا شکار کھیلنے نوڈیرو آیا کرتے تھے۔ وہ زلفی سے بہت متاثر تھے۔

زلفی سمندری قانون کی کانفرنس میں شرکت کے لئے جینوا گئے ہوئے تھے کہ ہمارے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ اطلاع ملتے ہی فوراً وطن واپس آ گئے اور بے حد غمزدہ تھے۔ باپ بیٹا متضاد نظریات رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔

زلفی کو ان کے اسکندر مرزا کی کابینہ کے لئے انتخاب کی اطلاع اس وقت ملی جب وہ اور نصرت ریکس سینما میں فلم دیکھ رہے تھے۔ اور یہ اطلاع ان کو سینما کے اندر ایک سلائڈ دکھا کر دی گئی جس پر لکھا تھا "ذوالفقار علی بھٹو کو فوراً گورنر ہاؤس طلب کیا گیا ہے" میرا خیال ہے کہ ان کی سینما میں موجودگی کی اطلاع 70 کلفٹن سے حاصل کی گئی تھی۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا

www.bhutto.org

کہ وہ وزیر تجارت بنائے جا رہے ہیں۔ ہم سب اس پر بہت خوش تھے اور اس موقعہ پر ہمیں والد بہت یاد آئے۔

زلفی فوراً گڑھی خدا بخش روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اس رات نصرت کو ہسپتال جانا پڑا اور اس کے چند گھنٹوں کے بعد شاہنواز پیدا ہوا وہ بہت پیارا سا بچہ تھا اور بڑا ہو کر اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ وہ عین عالم شباب میں صرف چھبیس سال کی عمر میں ایک سازش کے تحت دیار غیر میں قتل کر دیا گیا۔

جنرل ضیاء نے نہ صرف ہم کو بلکہ پوری قوم کو ایک ذہین اور قابل شخص سے محروم کر دیا۔ ان کے مخالفین بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایک محب وطن تھے۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت قابل آدمی تھے اور ایک عظیم سرمایہ بن سکتے تھے۔ وہ ایسے مقرر تھے کہ دنیا کے عظیم لوگ بھی ان کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو نے بھارت کے ساتھ پہلی جنگ کے موقعہ پر انڈونیشیا کے تمام وسائل ان کے حوالے کر دیئے تھے۔ مصر کے صدر ناصر، چو این لائی، شاہ فیصل، شام کے صدر اور کرنل قذافی کی مدد اور تعاون سے وہ جوہری توانائی کا پلانٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور فرانس کے سابقہ صدر گسکا رڈ ڈی۔ ایسٹینگ (Gis card D,Estaing) سب زلفی کے ذاتی دوست تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے چین کے ساتھ دوستی کی بنیاد رکھی۔ پاکستان کا کوئی بھی شخص دنیا کے عظیم مدبروں اور قائدین سے ذاتی دوستی اور ہم پلہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ قائداعظم کے بعد صرف وہ دنیا میں پہچانی جانے والی پاکستانی شخصیت تھے۔ زلفی کے مقدمہ نے پوری دُنیا کو ہلا ڈالا۔ کئی مسلم ممالک کے نمائندے ان کی جان بچانے کے لئے اسلام آباد پہنچے تھے اس لئے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ عالم اسلام کے لئے ان کی زندگی کتنی قیمتی ہے۔

میں بہت خوش قسمت ہوں کہ وہ عظیم شخص میرا بھائی تھا۔ بھائی کی حیثیت سے وہ بہت زیادہ محبت کرنے والے شخص تھے۔

اپنے اسکول کی تعلیم کے دوران جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کسی دوسری جگہ جاتے تو ہمارے لئے تحفے ضرور لاتے تھے۔ حالانکہ یہ سب کچھ ان کو قلیل جیب خرچ سے کرنا ہوتا تھا۔ میری شادی کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے رابطہ رکھتے تھے۔ جب بھی میں نے اپنی دوستوں اور ملنے والوں کے لئے ان سے مدد چاہی انہوں نے مجھے ناامید نہیں کیا۔

مجھے ان کے تمام کارناموں پر فخر ہے۔ خاص طور پر اس بے پناہ دلیری اور وقار پر جس کا

www.bhutto.org

مظاہرہ انہوں نے مقدمہ اور جیل کی کوٹھڑی میں قیام کے دوران کیا تھا۔ جیل کی کوٹھڑی میں بھی انہوں نے مجھے اور میرے شوہر کو کئی مسائل پر مشورہ دیا۔ اور وہاں وہ ہم سے اس طرح ملاقات کرتے تھے جیسے وہ کال کوٹھڑی نہیں بلکہ 70 کلفٹن اور وہاں کا خوشگوار ماحول ہو۔ اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو بے گناہ ہو۔

مجھے اس بات پر ہمیشہ افسوس رہے گا کہ ہم کو ان کی زندگی کے آخری دن ملاقات کی اجازت نہیں دی گئی۔ اگرچہ ہم کو اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ ہم ہر بدھ کے دن ان سے ملنے جاتے تھے اور اس دن وہ ہمارا انتظار کرتے تھے۔ میں اور میرے شوہر جب جیل پہنچے تو ہم کو بتایا گیا کہ نصرت اور بے نظیر ان سے ملنے آئی ہوئی ہیں۔ ہمیں اس پر بڑا تعجب ہوا کیونکہ وہ ان سے ملاقات کا دن نہیں تھا۔ بہرحال ہم انتظار کرتے رہے اور ہم نے دیکھا کہ گہرے رنگ کے شیشے والی ایک کار وہاں سے گذری۔ بعد میں بتایا گیا کہ حکام نے ہماری ملاقات منسوخ کر دی ہے۔ زلفی سے ملنے کے بعد ہم ہمیشہ نصرت اور بے نظیر سے ملنے سہالہ جاتے تھے جہاں ان کو نظر بند کیا ہوا تھا۔ اس بدھ کو بھی ہم سہالہ جانے لگے لیکن پولیس نے ہم کو روک لیا کہ ہم اپنے عزیزوں سے نہیں مل سکتے۔ اب ہمارا خوف اور بڑھ گیا۔ ہم نے فوراً اپنے وکیلوں سے رابطہ قائم کیا جو ابھی پنڈی میں ہی موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ بے نظیر نے ان کو پیغام بھیجا ہے کہ دوسرے دن یعنی جمعرات کو سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے یا وہ ہماری بدحواسی تھی۔ ہمارے وکلاء نے مشورہ دیا کہ ہم کو لاڑکانہ روانہ ہو جانا چاہئے۔ ہم پی آئی اے کے دفتر پہنچے لیکن موئن جوڈارو کے ٹکٹ دستیاب نہیں تھے۔ لہٰذا ہم کو کراچی پرواز کرنا پڑی۔ جب تک ہم نوڈیرو پہنچے کافی دیر ہو چکی تھی۔ حویلی کا زنان خانہ پہلے ہی بھر چکا تھا۔ ہر شخص رو رہا تھا۔ ہم بھی اپنے قبرستان روانہ ہو گئے۔

یہاں پر عورتیں اور مرد خاموشی اور بعض بلند آواز سے کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں اپنے بھائی کی قبر کے نزدیک کھڑی تھی اور میرے قریب ہی کھڑا ایک بوڑھا کسان ان کی قبر پر گل پاشی کر رہا تھا۔ اس نے ایک آہ بھری اور سندھی زبان میں کہا " آہا ذوالفقار تم ہم کو چھوڑ کر چلے گئے ہمارا کیا بنے گا " کیا اس کسان کو معلوم تھا کہ بھٹو کے بغیر سندھ پر مصیبتیں نازل ہوں گی۔ کیا اس نے جنرل ضیاء کے آدمیوں کو سندھ کی نسلوں کی آتش زنی اور تباہی کرتے دیکھ لیا تھا۔ کیا اس کو سندھیوں کی محرومی، کرب اور مصائب کے متعلق معلوم تھا جو جام صادق کے تشدد آمیز دور میں نازل ہوئے۔ کون جانتا ہے کہ سندھی پیدائشی بھولے بھالے اور مظلوم ہیں۔

www.bhutto.org

میرے پیارے چچا

شبنم بھٹو

- ..... جس کا ضمیر بڑے سے بڑے صحرا سے بھی بڑا تھا۔
- ..... جس کی محبت گہرے ترین سمندر سے بھی زیادہ عمیق تھی۔
- ..... جس کی شخصیت شبنم کے سرد ترین قطرے سے بھی زیادہ ٹھنڈی تھی۔
- ..... جس کی للکار شیر سے بھی زیادہ گرجدار تھی۔
- ..... جس کی نظر بلندیوں پر اڑنے والے شاہین سے بھی زیادہ تیز تھی۔
- ..... جس کے اصول ہمالیہ کی چٹانوں سے بھی زیادہ غیر متزلزل تھے۔
- ..... جس کی نظر دور ترین افق تک پہنچتی تھی۔
- ..... جس کی محبت کرنے والی شخصیت آپ کو ہمیشہ کے لئے اپنا گرویدہ بنالیتی تھی۔
- ..... جس کے خیالات کی پرواز بلند ترین آسمانوں سے بھی آگے تھی۔
- ..... جس کا نام مولا علی مرتضٰی کے مقدس نام پر رکھا گیا تھا۔
- ..... جن کو لوگ ان کے اپنے ذوالفقار علی بھٹو شہید کے طور پر یاد کرتے ہیں۔

وہ میرے چچا تھے۔ میرے مرحوم والد سکندر علی بھٹو کے چھوٹے بھائی۔ وہ جس طرح بچوں، جوانوں اور بزرگوں میں مقبول تھے اسی طرح ان کے خاندان کے لوگ بھی ان سے بہت

www.bhutto.org

محبت کرتے تھے۔ ہم ان سے اب بھی بہت محبت کرتے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی خاندان اور اپنے عوام سے محبت ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میری بہن رخسانہ اس وقت بہت چھوٹی تھی جب وہ ایوب خان کے دور میں اپنے چچا کے ساتھ بھوک ہڑتال پر تھی۔ وہ ایوب خان کے خلاف احتجاج کر رہے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ بھوک ہڑتال کر رہی تھی۔ جیل سے رہائی کے بعد وہ اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے ہمارے گھر نہیں آ سکے تھے۔ میں نے ان کو اطلاع بھیجی کہ میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گی جب تک وہ میرے پاس نہیں آتے۔ چنانچہ وہ فوراً میرے پاس پہنچے اور اس طرح میری بھوک ہڑتال ختم ہوئی۔ لیکن رخسانہ اس وقت تک بھوک ہڑتال ختم کرنے پر تیار نہ تھی جب تک اس کے چچا بھوک ہڑتال پر تھے۔

"بچے بھوک ہڑتال نہیں کرتے۔ چلو کچھ کھالو" انہوں نے رخسانہ کو سمجھاتے ہوئے کہا لیکن رخسانہ نے ایک نہ سنی اور آخر کار اس کے پیارے شہید چچا کو اپنی ہڑتال ختم کرنا پڑی۔

چچا شہید کو گوبھی اور گاجر کا اچار بہت پسند تھا جو میری چچیاں خود اپنے ہاتھ سے بناتی تھیں۔ یہ اچار ہم کو بھی بہت پسند تھے لیکن چچا کی شہادت کے بعد سے ہم نے ان اچاروں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

ہمارے والد کے انتقال کے بعد وہ ہمارے بھائی امداد علی بھٹو سے بہت پیار کرنے لگے تھے کیونکہ وہ لڑکا ہونے کی وجہ سے ہر وقت چچا کے ساتھ رہ سکتا تھا اور چچا بھی اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اس کا بہت خیال کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرا بھائی سردی کی بارش کے دوران شہید چچا کے ساتھ شکار پر گیا۔ میرا بھائی ذرا لاپرواہ سا تھا اس لئے وہ اپنے ساتھ گرم کپڑے نہیں لے گیا۔ چچا نے ملازمین کو بلایا اور اس پر سخت برہم ہوئے کہ انہوں نے امداد کو گرم کپڑے کیوں نہیں پہنائے۔ انہوں نے فوراً اپنا گرم کوٹ اتار کر امداد کو پہنا دیا۔ چچا کا وہ کوٹ امداد کے پاس بڑی حفاظت سے ایک بیش قیمت خزانے کے طور پر موجود ہے۔ ان کی سیاسی مصروفیات طویل عرصہ تک ان کو ہم سے دور رکھتی تھیں لیکن وہ ہمیشہ ہم سب کی طرف سے اپنے آپ کو باخبر رکھتے تھے۔ ان کی ہم سب کے ساتھ محبت کی شدت کو اس وقت سے نہیں ناپا جا سکتا تھا جو وہ ہم کو دیا کرتے تھے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ اس میں نمود و نمائش نہیں تھی بلکہ اس میں بے پناہ شدت اور گہرائی ہوتی تھی۔ رخسانہ جب بہت چھوٹی تھی تو بیمار ہو گئی۔ وہ اس وجہ سے افسردہ رہتی تھی کہ اس کے چچا ہر روز اسے دیکھنے نہیں آتے تھے لیکن ڈاکٹر بتاتے تھے کہ چچا ہر روز ٹیلی فون پر اس کی خیریت اور مختلف طبی ٹیسٹوں کے نتائج کے بارے میں معلوم کرتے رہتے تھے۔ وہ جب

www.bhutto.org

بھی لاڑکانہ میں ہوتے تھے ہمارے یہاں ظہروز آتے سے عام طور پر وہ بہت زیادہ مصروف رہتے تھے اور رات کافی دیر سے ہم سے ملنے آتے تھے۔ بچے ان کے آنے کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ اور ان سے ملے بغیر سوتے نہیں تھے۔ مجھے اور میری بہن کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ان کو ہمارے اس شوق کا علم تھا۔ وہ جب بھی آتے ہماری شاعری سننے کی فرمائش کرتے تھے۔ میں ان کو اپنا کلام سناتے وقت بوکھلا جاتی تھی۔ خاص طور پر جب وہ کہتے تھے "اس مرتبہ ہماری نوجوان شاعرہ نے کون سے شعر کہے ہیں آؤ سنیں" لیکن اس عمر میں ہم جیسے بھی شعر کہتے تھے اس پر ان کی ہمت افزائی کی وجہ سے ہمارے اندر کافی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اور ہماری شعر کہنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو گیا تھا اور ہم اس شوق کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ بچپن میں ہم ان پر بھی شعر کہتے تھے اگرچہ شعر ہم وزن نہیں ہوتے تھے لیکن ایک شعر مجھے ابھی یاد ہے جو پیش کرتی ہوں:۔

تم ہی تو ہے وطن کی شان ذوالفقار علی
تم تو ہو ہلال پاکستان ذوالفقار علی

جب ہم بڑے ہوئے تو ہم نے کہانیاں اور ناول لکھنا شروع کر دیا۔ جو زیادہ تر المیہ ہوتی تھیں۔ نصرت آنٹی نے اس بات کو محسوس کیا اور انہوں نے چچا سے کہا "میں نے ان کو منع کر دیا ہے کہ المیہ کہانیاں نہ لکھا کریں بلکہ ایسی باتیں لکھیں جس سے پڑھنے والے لطف اندوز ہوں"

"ان کو منع مت کرو۔ ان کو وہی کچھ لکھنے دو جو وہ سوچتی اور محسوس کرتی ہیں اور لکھنا چاہتی ہیں" چچا نے آنٹی کو مشورہ دیا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اصل زندگی میں ہمارے اور قوم کے لئے ایک المیہ ہونے والا ہے۔ چچا کی شہادت کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ انہوں نے چاند میں چچا کی شبیہہ دیکھی ہے۔ میں اور رخسانہ ہر رات جاگتے رہتے تھے۔ اور چاند کے طلوع سے غروب تک اسے تکتے رہتے تھے۔ لیکن ہم نے چچا کو چاند میں نہیں دیکھا۔ لیکن ان کی شہادت کے تین ماہ بعد ہم لوگ حضرت لال شہباز قلندر کے مزار پر حاضری دینے سیہون شریف گئے۔ وہاں پر بھی میں اور رخسانہ چاند کو تکتے رہے۔ ہر صبح چار بجے کے قریب ہم مزار پر جاتے تھے۔ وہاں سے واپسی پر ہم چائے پی کر سو جاتے تھے۔ ایک دن جمعہ تھا اور فجر کا وقت تھا اور ہم لوگ مزار سے واپس آئے تھے۔ میں نے چائے پی اور صحن میں ہی موجود رہی جب کہ رخسانہ اندر جا کر سو گئی۔

رخسانہ نے بتایا کہ ایک تیز روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ شہید چچا ساتھ والے کمرے میں کھڑے ہیں۔ انہوں نے کڑھی ہوئی قمیص شلوار پہن رکھی ہے۔ رخسانہ گھبرا گئی اور اس نے فوراً آنکھیں بند کر لیں اور پھر اسے ایک آواز

www.bhutto.org

آئی " آج جمعہ ہے اور شہید بھٹو مزار پر حاضری دینے آئے ہیں اور واپسی پر اپنے بچوں کو دیکھنے گئے ہیں "

جیل کی موت کوٹھڑی میں آخری ملاقات کے موقع پر انہوں نے شرمندگی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا " آج میں تم کو چائے کا ایک پیالہ بھی پیش نہیں کر سکتا " آج بھی جب وہ الفاظ یاد آتے ہیں تو چائے کی پیالی ہمارے ہاتھوں میں لرزنے لگتی ہے۔ جب ہم بچے تھے تو اسلام کے شہداء پر فخر کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ کاش ہم بھی ان کے دور میں پیدا ہوئے ہوتے اور ان سے ملے ہوتے۔

یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو آخری ملاقات کے موقع پر جب ہم نے اپنے شیر دل چچا کو اصولوں کی جنگ لڑتے دیکھا تو ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے سامنے۔ حیدر علی، ٹیپو، سراج الدولہ موجود ہیں۔ آج جب میرا بھائی امداد علی اپنے بچوں مہدی رضا، ضیغم عباس، محمد جواد، سکندر علی اور علی حسین کو یا میری بہن رخسانہ اپنے بیٹوں کو شہدائے اسلام کی کہانیاں سناتے ہیں۔ تو اس میں ذوالفقار علی بھٹو کا نام بھی شامل کرتے ہیں۔

ان کے ساتھ لگاؤ کے ساتھ میرا ان کے ساتھ خونی رشتہ بھی تھا۔ میں اپنے تاثرات کا اظہار شہید چچا کے لئے رخسانہ کی لکھی ہوئی اس نظم سے کرتی ہوں۔

اے میرے عہد کے عیسیٰ
اے ذوالفقار علی
ان فضاؤں میں مہکتے ہیں
تیرے خون کے گلاب
تیری غیرت کے چمکتے ہوئے
سورج کی قسم
تو نے باطل کے ارادوں کو
فنا کر ڈالا
آج ظلمت سے اجالے کو
جدا کر ڈالا
اے میرے عہد کے عیسیٰ.
اے ذوالفقار علی
تو ہراساں نہ ہوا ظلم کے ایوانوں سے

www.bhutto.org

تو نے ایک جنگ لڑی
وقت کے فرعونوں سے
تیری جرأت تیری عظمت
تیری غیرت کو سلام

www.bhutto.org

www.bhutto.org

لاکھوں کا محبوب

طارق اسلام

مجھے جب یہ مضمون لکھنے کو کہا گیا تو میں سخت تذبذب میں پڑ گیا اور میرا ردعمل فخر اور سراسیمگی کے درمیان جھولنے لگا۔ چچا کے طور پر شہید بھٹو کے متعلق یادیں مجتمع کرنا ایک مشکل اور پیچیدہ ذمہ داری تھی۔ اگر وہ ایک معمولی شخصیت یا ایک معمولی چچا ہوتے تو ان کی جا اور بے جا توصیف و تعریف میں صفحات کے صفحات لکھے جا سکتے تھے۔ لیکن وہ ان میں سے کچھ بھی نہ تھے۔ بھٹو قائد کے طور پر ایک دَور تھے اور عام لوگوں کے مقابلے میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ابتدائی عمر میں ہی وہ اپنے کام اور سیاست میں اس قدر مصروف ہو گئے تھے کہ ذہن پر بار بار زور دینے کے باوجود کوئی ایسے لمحات یاد نہیں آتے جب میں نے ان کو صرف چچا کے روپ میں دیکھا ہو۔

میں بہت کمسنی سے ہی ان کو ایک چچا سے زیادہ ایک قائد کی حیثیت میں سمجھنے کی آرزو رکھتا تھا۔ میں ان سے بہت متاثر تھا۔ وہ میرے تصورات پر اس وقت سے چھائے ہوئے تھے جب میں ایک لڑکا ہی تھا۔ ان کی سحر انگیز شخصیت بچوں پر بھی اثر انداز ہوتی تھی۔

میری ان کے ساتھ عقیدت کوئی معمولی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ بہت گہری تھی۔ اور ذوالفقار علی بھٹو سے عقیدت اور محبت چچا اور بھتیجے کے درمیاں محبت سے بالاتر تھی۔

شہید جب ایوب خان کی کابینہ میں وزیر تھے تو اکثر حیدر آباد آتے رہتے تھے جہاں ہم ان

www.bhutto.org

دنوں رہتے تھے۔ وزیر تجارت بننے کے بعد ان کی وہاں پہلی بار آمد مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میرے والدین نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی تھی اور اس موقع پر ہمارا مکان دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ حیدر آباد اس وقت ایک بہت چھوٹا سا شہر تھا اور وہاں کا ماحول گاؤں جیسا تھا۔ اس پارٹی میں ڈپٹی کمشنر، آئی جی پولیس اور بڑے بڑے وڈیرے بھی موجود تھے۔ وسیع سبزہ زار سے دور جہاں مہمان جمع تھے ایک شرمیلا سا لڑکا دروازے پر کھڑا بے چینی سے ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کا جلوس سائرنوں کی آواز کی گونج میں وہاں پہنچا۔ میں بھی ایک طرف زمین پر اکڑوں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے والدین نے ان کا خیر مقدم کیا۔ میں بھی مبارک باد دینے کے لئے تیزی سے ان کی طرف بڑھا وہ میرے اس عمل سے بہت خوش ہوئے اور ایک مسکراہٹ کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنے ساتھ مہمانوں تک چلنے کو کہا جو ان کے منتظر تھے۔ میرے لئے وہ ایک شدید خوشی کا لمحہ تھا کیونکہ یہ میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں ان کے قریب بیٹھوں اور ان کی عاقلانہ گفتگو سن سکوں۔ میں ان کی دوسرے سیاستدانوں اور افسران کے ساتھ دو منٹ کی گفتگو سننے کے لئے اپنے اور ان کے درمیاں گفتگو کے دو گھنٹے قربان کر سکتا تھا۔ وہاں پر موجود تمام مہمانوں کو وہ نام سے جانتے تھے اور ہر ایک کو مختلف انداز میں خیر مقدم اور سلام کا جواب دے رہے تھے۔ ان کی گفتگو کا مضمون ٹنڈو جام میں فصلوں کی خرابی سے لے کر ترقی یافتہ ممالک میں مشینوں کے استعمال پر مبنی ہوتا تھا۔

ایوب خان کے دور حکومت میں شہید نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں اور آخر کار ان کو وہ قلم دان مل گیا جس کے وہ متمنی تھے یعنی وہ پاکستان کے وزیر خارجہ بنا دیئے گئے اور اب ان کو عالمی سطح پر اپنی قابلیت، ناقابل یقین تدبر اور عالمی سیاست میں اپنی مہارت کا ثبوت دینا تھا۔ یہ بڑے اہم دن تھے۔ ایک نوجوان وزیر خارجہ ایک طرف اپنے ملک کے نوجوانوں کے دل جیت رہا تھا تو دوسری طرف ان کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم کی جا رہی تھی۔

انہوں نے مظلوم اور استحصال کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی نشاندہی کی۔ وہ مظلوم لوگوں کے ہیرو اور ان کی آواز بن گئے تھے۔ وہ تیسری دنیا میں سامراجی اور نو آبادیاتی نظام کے لئے ایک دیوار بن گئے تھے۔

1960ء کی دہائی کے انقلابی رہنما مثلاً سوئیکارنو ناصر بن بیلا اور چواین لائی سے ان کی دوستی اس آگ کی آئینہ دار تھی جو ان کے سینے میں سلگ رہی تھی اور اس منزل کی تمنا کی بھی جو انہوں نے اپنے اور اپنے ملک کے لئے متعین کی تھی۔ پاکستان کے نوجوانوں کے لئے وہ ایک مقناطیسی شخصیت بن گئے تھے۔ ایک ایسے ملک میں جو دقیانوسی، بیمار اور پرانے سیاستدانوں کا عادی

www.bhutto.org

ہو چکا تھا اور اس کا کوئی وقار تھا نہ اہمیت۔ ذوالفقار علی بھٹو کا آ جانا ایسا ہی تھا جیسے ایک نیا باب کھل گیا ہو۔ انہوں نے قوم کے اندر فخر کے جذبات پیدا کئے اور ان کو بے ساختہ خوشیاں دے کر سڑکوں پر لے آئے۔ شہید کی اقوام متحدہ میں وہ تاریخی تقاریر جنہوں نے بھارتی وفد کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ ان کے اعلان تاشقند سے اختلاف نے ان کو ہر نوجوان کے خواب کی تعبیر بنا دیا تھا۔

1960ء کی دھائی ایک انقلابی دور تھا۔ پرانے نظام کی تبدیلی کی ہوائیں چل پڑی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جس نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی تشکیل نو شروع کر دی تھی۔ 1960ء میں نوجوان ہونا اور پھر بھٹو صاحب کا بھتیجا ہونا میرے لئے بہت مسحور کن بات تھی۔ میرے اسکول کے دوست میرے گرد جمع ہو جاتے تھے اور ان کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ وہ سب ان کے متعلق معمولی سی بات بھی جاننا چاہتے تھے۔ اور پھر بڑی بے چینی سے میرے تاثرات سننے کا انتظار کرتے تھے۔ اب میں وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کا نہیں بلکہ ایک عوامی ہیرو کا بھتیجا تھا۔ مجھے ان کا وہ تاریخی ریل گاڑی کا سفر یاد ہے جو انہوں نے ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دینے کے بعد راولپنڈی سے لاڑکانہ تک کیا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں ہر عمر کے لوگ ہر اسٹیشن پر ان کے والہانہ خیر مقدم کے لئے جمع ہو گئے تھے خاص طور پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر انسانوں کا سمندر جس طرح جمع ہوا تھا اور جس طرح اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تھا اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ عوام کے جذبات اور عقیدت کو دیکھ کر شہید کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے تھے۔ مجمع میں ہر شخص کی یہ کوشش تھی کہ وہ کسی طرح وہ رومال حاصل کر لے جس سے شہید نے اپنے آنسو پونچھے تھے اور اس سلسلہ میں عوام میں اچھی خاصی مہم جوئی ہوئی۔

یہ سب کچھ ایسے دور میں ہو رہا تھا جب آمر کے خلاف کوئی کسی کے کان میں بھی بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کا انجام خوفناک سزا کی صورت میں ہوتا تھا۔ اس وقت ہم کراچی منتقل ہو چکے تھے اور یہ وہ دور تھا جب میرا ان کے ساتھ سب سے زیادہ رابطہ رہا کیونکہ شہید بھی کراچی آ گئے تھے اور وہیں رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ انہی کا گھر تھا جہاں ہم اپنے چچا زادوں کے ساتھ کرکٹ یا دوسرے کھیل کھیلتے تھے یا ان کے ساتھ خوش گپیاں کرتے تھے۔

ایوب خان کے خفیہ ادارے ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ اور ان کے پاس آنے جانے والوں کو دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان سے بچنے کے لئے شہید ہمارے گھر پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ ملاقاتیوں کے آنے سے پہلے ہی ہمارے گھر پہنچ جاتے تھے اور ہم سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ مجھ سے اسکول کی کارکردگی کے متعلق سوالات کرتے تھے اور تعلیم کی اہمیت واضح کرتے تھے۔ اس موقع پر میں ان کو ان کا پسندیدہ گانا "اسٹرینجر ان دی نائٹ"

www.bhutto.org

(Stranger in the night) سنانے کی پیش کش کر دیتا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اس پیش کش کو رد نہیں کریں گے۔ دراصل مجھے اسکول اور پڑھائی کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ان سے سیاست اور سیاسی منصوبوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور اس کے لئے مجھے ان کے ملاقاتیوں اور مہمانوں کی آمد کا انتظار کرنا ہوتا تھا جس کے آ جانے پر میں ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور چوری چوری ان کی گفتگو سنتا رہتا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے اس گفتگو سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اب سیاسی حالات میں گہما گہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اور خاموش ماحول میں بے چینی اور اضطراب رونما ہونے لگا تھا۔ ایوب خان کے خلاف عوام میں شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی اور مسٹر بھٹو اسی تناسب سے مقبول ہو رہے تھے۔ عوام ان کو نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ میں اور میرے دوست مضطرب تھے وہ سب مجھے تنگ کرتے تھے اور میں اپنے مشترکہ جذبات اپنے چچا زاد میر (میر مرتضیٰ) کو پہنچا دیتا کہ ان کے والد ایوب خان کے خلاف کب تحریک شروع کریں گے۔ وہ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔ موقع گزرا جا رہا ہے۔ شہید ایک موقع شناس سیاست دان تھے۔ ان کا ہر قدم بروقت اور سیاسی حالات کے مطابق نپا تلا ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی سیاست میں سائنس اور ادب کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اور پھر اس میں تدبر کی آمیزش نے شہید کو ایک سخت اور بااصول سیاست دان بنا دیا تھا۔ ان کے سیاسی نظریات کی بنیاد وقت کی ضرورت کے عین مطابق رکھی گئی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ سیاست خود ایک زبردست طاقت ہوتی ہے جس کا اپنا برقی ہالہ ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ فلیتہ کو کس وقت آگ لگائی جائے کہ وہ آمر کو نیست و نابود کر دے۔ اور یہ موقع 1967ء کے اوائل میں آ پہنچا جب شہید کی بڑھتی ہوئی مقبولیت۔ ان کے جیالے نوجوانوں بت شکن اور حقیقت پسند شخصیت سے خوفزدہ ہو کر ایوب خان نے اپنے کاسہ لیس وزراء کو ہدایت کی کہ وہ بھٹو کا عوامی پلیٹ فارم پر مقابلہ کریں چنانچہ بھٹو صاحب کو بھی اپنی مقبولیت اور وقار کے دفاع کے لئے ایسے ہی رد عمل پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح سیاسی رسہ کشی کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ سیاسی میدان میں کس کا پلہ بھاری ہے۔ جو آخر کار ایوب کے دور حکومت کے زوال کا باعث بنا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد 30 / نومبر 1967ء کو رکھی گئی اور اس کا افتتاح لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر ہوا۔ میں فوراً پارٹی کا رکن بننے کے لئے پچیس پیسے لے کر وہاں پہنچا۔ پی پی پی کے سرکردہ لوگ بتائیں گے کہ عوام میں سے پہلا شخص میں تھا جس نے پارٹی کی رکنیت حاصل کی۔

پی پی پی کے قیام کے بعد شہید نے ایوب پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ اس کے لئے انہوں

www.bhutto.org

نے جو طریقہ اختیار کیا وہ دو لحاظ سے پاکستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا تھا۔ اول یہ کہ اس سے پہلے کسی سیاستدان نے اتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ ایک مسلمہ آمریت کے خلاف آواز نہیں اٹھائی تھی جس نے اپنے ظالمانہ ہتھ کنڈوں سے عوام کے دلوں میں دہشت بٹھا دی تھی۔ دوئم یہ کہ اس سے قبل کسی قائد نے عوام سے براہ راست رابطہ نہیں کیا تھا۔ شہید نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے عوام سے اس انداز میں خطاب کیا جس کی ضرورت تھی۔ شہید نے روائتی سیاسی طریقہ کار سے ہٹ کر غریب اور مظلوم عوام سے براہ راست رابطہ کا طریقہ اپنایا۔

1967ء کے موسم خزاں میں حیدر آباد کے ایک جلسہ عام میں لاکھوں کی تعداد میں عوام جمع ہو گئے تھے جس سے خوفزدہ ہو کر اس وقت کے مغربی پاکستان کے گورنر موسیٰ خان نے نہایت غلیظ گالیاں دے کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا تھا۔ موسیٰ خان نے شہید کو طعنہ دیا تھا کہ ان کے جلسوں میں صرف رکشہ والے، تانگے والے اور محنت کش جمع ہوتے ہیں۔ شہید ایک حاضر جواب اور ذہین سیاست دان تھے۔ انہوں نے اس طعنہ کا جواب ایوب حکومت کا حوالہ دیتے ہوئے دیا کہ انہیں فخر ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے نمائندہ ہیں جن کے تن پر کپڑے بھی نہیں ہیں۔ اس کے بعد شہید نے کراچی سے خیبر تک دورہ کیا اور بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا۔ انہوں نے شہروں اور دیہاتوں میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ قریہ قریہ اور شہر شہر جھونپڑیوں تک گئے۔ یہ ان کا کرشمہ سحر انگیزی اور مقناطیسی شخصیت تھی کہ وہ جہاں بھی گئے لوگ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ جوں جوں اس میں تیزی آئی سیاسی بخار بھی بڑھنے لگا۔ اور پورا پاکستان ایک انقلاب کی زد میں آ گیا۔ خوفزدہ اور مشتعل ایوب خان نے اپنے رد عمل کا اظہار اس طرح کیا کہ نومبر 1968ء میں شہید کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر پورے پاکستان میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک مظاہرے میں شرکت کے لئے کراچی جا رہا تھا میرے ساتھ میرے چند دوست بھی تھے۔ راستے میں ہم پر آنسو گیس چھوڑی گئی اور لاٹھی چارج کیا گیا۔ اور بعد میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ کئی گھنٹہ حوالات میں بند رہنے کے بعد ایک دوست کے اثر و رسوخ سے ہمیں رہائی ملی۔

شہید کی طرف سے عدالت عالیہ میں پیش کردہ عہد نامہ ایک سیاسی شاہکار تھا۔ اس میں نہ صرف ان کی غیر قانونی حراست کو چیلنج کیا گیا تھا بلکہ وہ طلباء، دانشوروں، پیشہ وروں کے لئے بھی ایک سیاسی عہد نامہ ثابت ہوا جس نے ان کے دلوں میں آگ بھڑکا دی۔ دوسری طرف حکومت نے پریس پر مکمل پابندی لگا دی اور اس بات کو یقینی بنایا کہ شہید کی کوئی تقریر یا بیان شائع نہ ہونے پائے۔ اس طرح ایوب خان نے خود اپنے لئے گڑھا کھود لیا۔ پی پی پی نے ایسے پلے تیار کرائے

www.bhutto.org

جن پر لکھا تھا "بھٹو کو آزاد کرو" مجھے یاد ہے کہ یہ بلے خود بے نظیر بھٹو کراچی کی الفنسٹن اسٹریٹ پر تقسیم کر رہی تھیں۔ جوشیلا مجمع اکٹھا ہو گیا اور تمام بلے آناً فاناً ختم ہو گئے۔

میں نے چچا کو ساہیوال جیل خط لکھا۔ جس میں میں نے اپنے دلی جذبات پوری طرح سموئے تھے۔ میری خوشی کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہی جب ان کی طرف سے مجھے اس کا جواب موصول ہوا۔ وہ خط آج بھی میرے پاس موجود ہے اور میری زندگی کا عظیم اور قیمتی سرمایہ ہے۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا۔

"جب تک مجھے تمہارا 15 / جنوری کا محبت بھرا خط موصول نہیں ہوا تھا مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔ یقیناً میں نے تم کو بڑھتے ہوئے دیکھا ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تمہارے ذہن میں بالیدگی پیدا ہو۔ تمہارے خط سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے اور بہت آہستہ بھی اور یہ اس کے استعمال کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اسے کیسے گزار دے۔ بچے بہرحال بچے ہی ہوتے ہیں چاہے وہ کتنے ہی بڑے ہو جائیں۔"

ایک جگہ پر انہوں نے اپنے پسندیدہ مضمون "تعلیم" پر کہا تھا

"آج کی دنیا میں علم سے زیادہ ضروری کوئی چیز نہیں ہے۔ علم کے سوا ہر چیز ختم ہو سکتی ہے۔ چھینی جا سکتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ گزشتہ دور کے مقابلے میں یہ ایک حقیقت ہے۔ تم کو اپنے مستقبل کا انتخاب عقلمندی سے کرنا چاہئے اور پھر اس پر پوری توجہ دینی چاہئے۔"

انہوں نے اپنے ملک کے عوام اور نوجوانوں کے نام بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ آج چوبیس برس بعد بھی جب میں اس خط کو پڑھتا ہوں تو جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی ہے ان میں کچھ اقتباسات میں بیاں کرنا چاہوں گا۔

"ہر چیز تیزی سے حرکت میں ہے۔ پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہئے اور اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرنا چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم عملی طور پر واقعات میں دلچسپی لے رہے ہو۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ نئی نسل کو اس ملک کا مستقبل سنوارنے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ مجھے پاکستان کے نوجوانوں سے گہرا لگاؤ ہے۔ اور میں ان کے جذبات کو

www.bhutto.org

بخوبی سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان میرے گرویدہ ہیں۔ میری ان نوجوانوں سے بے انتہا امیدیں وابستہ ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مؤثر طور پر مستقبل کے چیلنج کا مقابلہ کر سکیں گے۔ ملک ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ لیکن یہ دور گزر جائے گا۔ ہمیں قربانی دینی ہو گی ورنہ مستقبل میں کوئی بہتر تبدیلی نہیں آئے گی۔ اب چونکہ لوگوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب ایک منصفانہ معاشرہ جنم لے گا۔ جیل کی زندگی کوئی اچھی زندگی نہیں ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لئے یہ بات بڑی ہمت افزاء ہے کہ عوام مجھے یاد کرتے ہیں۔ عوام کے دلوں میں رہنے سے بہتر کسی اور چیز کی تمنا نہیں کی جا سکتی۔ میں نے اپنی دانست میں پاکستان کے عوام کی بہترین خدمت کی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مجھے فراموش نہیں کیا ہے۔ تم اپنے آپ کو حالات سے باخبر رکھنا۔ تم جتنا موجودہ بحران کا مطالعہ کرو گے اور اس کے "کیوں اور کیا" (وجوہات) کو جاننے کی کوشش کرو گے اتنا ہی تم زندگی کے متعلق زیادہ جان سکو گے۔ میرا جیل کا وقت گزر جائے گا دنیا کا کوئی آمر اسے نہیں روک سکتا۔ تم میں سے کسی کو بھی فکر مند نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بالکل غلط ہو گا کہ تم ان وجوہات کی بناء پر اپنی تعلیم پر توجہ نہ دو۔ دراصل ابھی ہم پر کوئی مصیبت نہیں آئی ہے اور یہ انشاء اللہ آنے والا وقت بتائے گا۔ لیکن اگر واقعی مشکلات درپیش ہوں تو ہمیں ان سے مقابلے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ مجھے غیر منصفانہ طریقہ پر جیل میں ڈالا گیا ہے اس لئے تم کو اپنی تعلیم پر اور بھی زیادہ توجہ دینی چاہئے تاکہ یہ یقین کیا جا سکے کہ ہمارا مستقبل اس طرح کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے پاک ہو گا۔ ہم ایک غریب ملک میں ہین اور ہمارے وسائل محدود ہیں۔ ہمیں ان وسائل کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنا ہو گا تاکہ ہمارے عوام کی غربت اور بدحالی دور ہو سکے۔ صرف سوشلزم ہی ایسا نظام ہے جس کے ذریعہ ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایوب خان یہ سمجھ لیتے تو ان کے لئے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ یہ کوئی ایسا نظام نہیں جسے صرف ہم پسند کرتے ہیں بلکہ یہ عوام کے لئے بھی بہتر ہے۔ دیر یا بدیر لوگ وہ حاصل کر لیتے ہیں جو ان کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ اور انہیں ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر سوشلزم کو صحیح طریقہ پہ واضح کیا جائے تو لوگ نہ صرف اس کو سمجھیں گے بلکہ قبول بھی کر لیں گے۔

www.bhutto.org

ہماری پارٹی کے منشور میں جسے ہم "فاؤنڈیشن پیپرز" کہتے ہیں واضح کیا گیا ہے کہ سوشلزم کیا ہے۔ صرف وہی لوگ سوشلزم سے اختلاف کریں گے جو عوام کو لوٹنا اور ان کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر سکیں گے جلد ہی ان کو اس کا حساب دینا ہو گا۔ تم میرے لئے فکر مند نہ ہو۔ اپنی فکر کرو اور اپنے آپ کو ملک کی خدمت کے لئے تیار کرو"

یہ خط دو "فُل سکیپ" سائز کے کاغذوں پر ٹائپ کیا گیا تھا اور انہوں نے اپنے وکلاء کے ساتھ ملاقاتوں اور مصروفیات کے باوجود مجھے لکھا تھا لہٰذا میں اس سے بے پناہ متاثر ہوا تھا۔

فروری 1969ء میں عدالت عالیہ نے حکم دیا کہ ان کو ان کے لاڑکانہ والے مکان میں نظر بند کر دیا جائے۔ میں اپنے چچا زادوں کے ساتھ لاڑکانہ گیا۔ ایک پروقار گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس مسٹر بھٹو نے برآمدے میں ہمارا استقبال کیا۔ ائیر مارشل اصغر خان جنہوں نے ہمارے ساتھ ہی موئن جوڈارو کی پرواز میں سفر کیا تھا ہمارے ساتھ ہی وہاں پہنچے تھے۔

یہ بات بالکل صاف ظاہر تھی کہ جیل نے شہید کے جذبات کو سرد نہیں کیا تھا۔ بلکہ اور زیادہ سخت اور کامیابی کے لئے پراعتماد بنا دیا تھا۔ شہید نے استحصال کے خلاف احتجاج کی ایک لہر دوڑا دی تھی اور طلباء ان کا ہراول دستہ تھے۔ جلسے، جلوس اور مظاہرے پہلی بار پاکستان کی سیاست کا حصہ بنے تھے اور اس سلسلے میں ہم سب ان کے ساتھ تھے۔ ان کو سننا، ان سے باتیں کرنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا ہمارے لئے ولولہ انگیز بات تھی۔ شہید نے تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی اور ہنگامی حالات کے خاتمے کا مطالبہ شروع کر دیا اور اس کے لئے انہوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بھوک ہڑتال کے دوران جو تین چار دن جاری رہی وہ "المرتضیٰ" کے پورچ میں بیٹھے رہے جہاں باہر نعرے لگانے والے عوام ان کو صاف طور پر دیکھ سکتے تھے۔ عوام کے شدید دباؤ کی وجہ سے ایوب خان ان کے مطالبات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو گئے اور شہید کو رہا کر دیا گیا۔ فوراً ہی لاڑکانہ کی سڑکوں پر جشن فتح منایا گیا اور لوگ فتح کے گیت گاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ "جئے بھٹو اور ہو جمالو" جیسے نعرے لگا رہے تھے۔ یہ ایک طلسم تھا۔ اور اس طرح کی عقیدت کا اظہار صرف صوفیان کرام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ شہید اپنی دونوں مٹھیاں اس طرح جوڑ کر دکھا رہے تھے جیسے وہ ہتھکڑی میں بندھی ہوں۔ پھر وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے اس طرح الگ کرتے تھے جو زنجیریں ٹوٹنے کی علامت ظاہر کرتے تھے۔ ان کے اس عمل کا ڈرامائی ردعمل ہوا اور عوام کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر جوش سے بے قابو ہو گیا۔ میں اپنے چچا زادوں کے ساتھ ٹرک پر سوار تھا جو آہستہ آہستہ لاڑکانہ کی تنگ سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ میں اس انسان نما دیو ہیکل شخصیت

www.bhutto.org

سے مسحور ہو چکا تھا۔ جس نے ہر جسم میں بجلی کی سی لہر دوڑا دی تھی۔ یکایک ایک شخص ٹرک کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے پستول نکالا اور شہید کا نشانہ لینے لگا۔ شہید کے چہرے پر کسی قسم کے خوف کے آثار نہیں تھے۔ ان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ انہوں نے مڑ کر ہمیں دیکھا کہ ہم محفوظ ہیں یا نہیں۔ عین اس وقت مجمع نے جھپٹ کر اس متوقع قاتل کو گرفت میں لے لیا اور اس کو بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ لیکن شہید نے فوراً مداخلت کی اور مسٹر کپٹر اور حیات محمد خان شیر پاؤ سے جو اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ کہا کہ وہ اس آدمی کو عوام کے غضب سے نجات دلائیں۔ مایوسی کے عالم میں ایوب خان کی شہید کو اپنے راستے سے ہٹانے کی یہ آخری کوشش ناکام ہو گئی اور ان کا زوال قریب آ پہنچا۔

شہید نے بذریعہ ریل گاڑی کراچی جانے کا فیصلہ کیا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ میں اور میرے چچا زاد بھی انکے ہمراہ ہوں گے۔ ہم سب کراچی جانے والی بولان میل پر سوار ہو گئے۔ ہم سب ایک ہی ڈبے میں سوار تھے اور ایک تاریخی سفر پر رواں دواں تھے۔ دوران سفر شہید ہم کو لطائف اور ایوب خان کی مضحکہ خیز شعبدہ بازی کے قصے سنا کر لطف اندوز کرتے رہے۔ ساری رات اور دوسرے دن دوران سفر ریل گاڑی ہر چھوٹے اسٹیشن پر رک جاتی تھی۔ قریبی مضافات اور ہر اسٹیشن پر ایک ہی منظر ہوتا تھا۔ چاہے وہ دادو، سکھر ہو یا حیدر آباد۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ اپنے قائد کے استقبال کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ شہید اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر نکل آتے اور اپنے مخصوص طرز تخاطب سے ان کو مسحور کر دیتے تھے اور پھر مجمع ایک کبھی نہ ختم ہونے والی خوشی سے بے قابو ہو جاتا تھا۔ سحر انگیزی کا یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا جو روسی انقلاب کے بعد شاید لینن نے بھی اپنے گھر واپسی پر نہ دیکھا ہو گا۔ دوران سفر پی پی پی کے دوسرے رہنما بھی ہم سے آ ملے ان میں ممتاز علی بھٹو اور حفیظ پیرزادہ مجھے یاد ہیں۔ سفر کے اختتام پر ہماری گاڑی کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچی جہاں عوام کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ بوڑھے، نوجوان، عورت مرد سب اپنے محبوب قائد کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں جمع تھے۔ فضا "بھٹو زندہ باد، ایوب مردہ باد" کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اس کے بعد شہید نے کراچی کی سڑکوں پر ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کی اور جگہ جگہ ایوب خاں کے خلاف دلیرانہ تقاریر کیں۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے اور آخر کار ایوب خان عوام کے ناقابل برداشت دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے اور انہوں نے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ الیکشن کی تاریخ مقرر ہونے کا اعلان ہوا جس کے فوراً بعد شہید نے پاکستان کے کونے کونے اور ایسے دور دراز علاقوں کا دورہ شروع کر دیا جہاں اس سے قبل کسی پاکستانی حکمران نے جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ مجھے

www.bhutto.org

یاد ہے کہ ایک نوجوان کی حیثیت سے میں نے ہر اس جلسے میں شرکت کی تھی جس سے شہید نے خطاب کیا تھا۔

عام انتخابات سے چند دن قبل میں اپنے چچا زادوں کے ساتھ لاڑکانہ پہنچ گیا۔ آخر کار وہ دن آ یا جب انتخابات کے نتائج آنا شروع ہو گئے اور وہ ہماری توقعات سے بہت آگے نکل گئے۔ یہ پی پی پی کی عظیم کامیابی تھی۔ بڑی بڑی قد آور شخصیات اس کامیابی کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکیں۔ شہید "المرتضٰی" کے سبزہ زار میں ریڈیو پر انتخابات کے نتائج سن رہے تھے۔ اور لوگوں سے مبارک باد وصول کر رہے تھے جو آہستہ آہستہ بڑی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے تھے۔ پی پی پی نے مغربی پاکستان میں مکمل کامیابی حاصل کر لی تھی اور شہید نے انتظامیہ، سیاسی پنڈتوں اور مبصرین کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا جنہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ان کو مٹھی بھر نشستوں سے زیادہ نہیں مل سکیں گی۔

شہید کی انتخابات میں شاندار اور بے مثال کامیابی کے بعد ملک کی تاریخ میں ایک تاریک، تنگ دلانہ اور گندے دور کا آغاز ہوا جب فوجی جنتا نے اپنا پرانا اور بدصورت رومیوں جیسا کھیل شروع کر دیا۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد مایوس اور شکست خوردہ جنتا نے ٹوٹے ہوئے پاکستان کا اقتدار شہید کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پاکستان کے لئے ایک تاریخ ساز دور تھا۔ جو تاریخ میں محفوظ ہے اور جس پر شہید نے اپنے خون سے دستخط کئے۔

5 رجولائی 1977ء پاکستان کی تاریخ کا ایک تاریک ترین دن تھا جب جنرل ضیاء نے ایک چور کی طرح عوام کی پسندیدہ پی پی پی کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس کے بعد شہید کو ایک نام نہاد فرضی سیاسی قتل میں ملوث کر کے ان پر مقدمہ دائر کر دیا جو عدلیہ کے کمرے میں کھیلا جانے والا تاریخ کا بدترین اور شرمناک ڈرامہ تھا۔

شہید کی اسیری کے دوران میر مرتضٰی اور شاہنواز کی طرح میں بھی لندن میں تھا۔ مارچ 1979ء کے آخری ہفتہ میں میر نے مجھ سے کہا کہ میں پاکستان جا کر ان کے والد سے ملاقات کروں اور کچھ پیغامات ان تک پہنچا دوں۔ اس وقت ہم لندن میں ایک بین الاقوامی انصاف کی کانفرنس منظم کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو شہید کے مقدمہ کی کارروائی کا جائزہ لے کر اس کی مضحکہ خیزی کو عیاں کرے۔ میرے ذمہ یہ کام تھا کہ میں تمام متعلقہ قانونی مواد جمع کر کے لندن لاؤں۔ کچھ خوف اور پریشانی کے بعد آخر کار میں راولپنڈی پہنچا۔ اور وزارت داخلہ کو درخواست دینے پر مجھے 27 رمارچ کو اپنا چچا سے ملنے کی اجازت مل گئی اور میں مقررہ وقت پر راولپنڈی جیل پہنچ گیا۔ ان کی کوٹھڑی تک جانے کے لئے بے ہنگم راستوں اور آہنی سلاخوں والے دروازوں سے گزرتے

www.bhutto.org

ہوئے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں پنجرے میں بند ایک شیر کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ یار محمد انسپکٹر پولیس جو ڈیوٹی پر میرے ساتھ تھا۔ راستے بھر مجھ سے کہتا رہا کہ میں اپنے چچا کو ضیاء سے رحم کی درخواست کرنے پر آمادہ کروں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ رحم کی درخواست سے ان کی جان بچ جائے گی۔ آخر کار ہم شہید کی کوٹھڑی تک پہنچ گئے۔ میں نے یار محمد سے کال کوٹھڑی کا تالہ کھولنے کو کہا کیونکہ میں سلاخوں کے پیچھے سے اپنے چچا سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ میرے چچا نے میرے اس احتجاج کو سن لیا۔ اور میری زندگی کی بدترین ملامت کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا اور کہا "تم اس شخص سے کیا احتجاج کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ تم کو مجھ سے گلے ملنے کے لئے اندر آنے دے گا۔ اس تشدد اور بدسلوکی کے بعد جو وہ مجھ سے کرتا رہا ہے۔ میں اس سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔"

میرے لئے ایک کرسی لائی گئی اور میں ان سلاخوں کے ساتھ بیٹھ گیا جس کے دوسری طرف شہید تھے۔ میرے سر پر چار محافظ سوار تھے اور جھک کر ہماری گفتگو سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس قابل مذمت صورت حال سے میری توجہ ہٹانے کے لئے میرے چچا نے مجھ سے دریافت کیا "کیا یہ قمیص جو تم نے پہن رکھی ہے ٹرن بل اینڈ آسر (Turnbull & Asser) کی ہے" "جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"تم اس لباس میں بہت اسمارٹ لگ رہے ہو" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی خبردار کیا کہ میں بات کرنے میں ہوشیار رہوں کیونکہ وہاں جاسوسی کے آلات نصب کئے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے میر شاہنواز، صنم اور میرے متعلق دریافت کیا۔ وہ اس بات کے شدت سے متمنی تھے کہ وہ سب اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ دیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت قلق ہوا کہ ان کے لئے بیت الخلاء کا انتظام بھی ان کی کوٹھڑی کے دروازے کے بالکل ساتھ کیا گیا ہے۔ اس طرح کہ وہ جیل کے عملے کو نظر آتا رہے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے جو تکلیف ہو رہی تھی شہید نے اس کو بھانپ لیا اور مسکراتے ہوئے کہا "یہ سب میری تضحیک کے لئے کیا گیا ہے! آخر میں نے اپنی قوم کی خدمت کی ہے۔ میرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے۔ نازیوں کے قید خانے بھی اس سے بہتر ہوں گے"

میں نے اخبارات میں اس گھناؤنی متعفن صورت حال اور ان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے بارے میں پڑھا تھا۔ جو ایک سابق وزیر اعظم کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے ہیں۔ اور آج میں اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد کمزور اور لاغر نظر آ رہے تھے لیکن ان کا جذبہ اور روح غیر متزلزل تھی۔ ان کو ایک چھوٹی سی

www.bhutto.org

کوٹھڑی میں بند کیا گیا تھا جس کی لمبائی بارہ فٹ اور چوڑائی چھ فٹ سے زیادہ نہ تھی جو انسان تو در کنار کسی جانور کے لئے بھی ناکافی تھی۔ ان کے لئے کوئی بستر بھی نہیں تھا اور ان کو سخت اور ننگے فرش پر سونے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ تھا وہ سلوک جو ملک کے منتخب وزیر اعظم کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ جس نے مسلح افواج کا وقار بلند کیا۔ نوے ہزار قیدی واپس لایا۔ اور اپنے علاقہ کا ایک ایک انچ واپس لیا جب کہ مصر اور شام ابھی تک اسرائیل سے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ تھا ان کا سلوک اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئرمین کے ساتھ، یہ تھا ان کے اظہار تشکر کا طریقہ اس شخص کے لئے جس نے ایک شکست خوردہ اور مایوس قوم کو زندگی دی اور عالمی برادری میں پھر سے وقار بلند کیا۔

مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ انہوں نے اپنی موت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے اور اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر لیا ہے۔ اب ان کو صرف یہ فکر تھی کہ تاریخ میں ان کی کیا حیثیت ہو گی اور لوگ ان کو کس طرح یاد کریں گے۔

"غیر ممالک اور اخبارات میرے لئے کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے جواب دیا "وہ کہتے ہیں کہ آپ بے گناہ ہیں اور آپ کے خلاف مقدمہ جھوٹا ہے"

"میں جانتا ہوں! میں جانتا ہوں" انہوں نے اپنے بازو لہرا کر کہا۔

"وہ میرے کارناموں فہم و فراست اور تاریخ میں مقام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

میرے سامنے اس وقت صرف ایک شخص نہیں تھا بلکہ ایک پورا ماحول میرے سامنے تھا۔ جہاں ایک شخص موت سے آنکھیں ملا رہا تھا۔ جس کو جیل کا عملہ مسلسل ایک گندی دم گھٹنے والی تنگ کوٹھڑی میں تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی موت کی کوٹھڑی سے باہر دنیا کی وسعتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ "میں اپنے عوام کے دلوں میں رہوں گا میں تاریخ کا ایک باب بن جاؤں گا۔ لوگ میرے اوپر شعر کہیں گے۔ اور میرے گیت گائیں گے" انہوں نے بڑے اعتماد سے پیش گوئی کی تھی۔

میرے لئے ملاقات کا مقرر کردہ وقت صرف تیس منٹ تھا جو تیزی سے گزر رہا تھا۔ میں نے اپنے چچا سے قریب ہو کر آہستہ سے ان سے کچھ کہنا چاہا کیونکہ وہاں جاسوسی آلات کا جال موجود تھا۔ ان کو کئی پیغامات پہنچانے تھے اور ان کا جواب اور ہدایات حاصل کرنا تھا جن پر عمل کیا

www.bhutto.org

جا سکے۔ جوں ہی ملاقات کا وقت ختم ہوا میں نے ان کو رحم کی اپیل کے متعلق یار محمد کا پیغام پہنچایا لیکن یہ میری غلطی تھی۔ مجھے شہید کو بہتر طور پر جاننا چاہئے تھا۔ لفظ "رحم" اس بااصول آدمی کی لغت میں ہی موجود نہیں تھا۔ وہ غصے سے چیخ پڑے۔

"میری زندگی خدا کی امانت ہے۔ ضیاء کی نہیں اور میرا نام تاریخ میں لکھے جانے کے لئے ہے۔ وہ ناامید ہو چکے ہیں اور بوکھلا گئے ہیں وہ مجھے تو ختم کر سکتے ہیں لیکن میرے عزم اور جذبہ کو نہیں۔ وہ میرے نام کو بھی تاریخ میں لکھے جانے سے محروم نہیں کر سکتے"

یکم اپریل کو ہمیں ایک اور ملاقات کی اجازت دی گئی۔ سخت جامہ تلاشی کے بعد وہی پولیس والا مجھ شہید کی کوٹھڑی تک لے گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور کہا "میرے تمام ملاقاتی آج ہی جمع ہو رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل تمہاری چچی اور بے نظیر مل کر گئی ہیں۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ان کے قتل کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہم سلاخوں کے دونوں طرف بیٹھے ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا "کیا بات چیت ہوئی"

"تمام حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سزا پر عمل درآمد کر کے رہیں گے" میں نے بڑی بے چارگی سے ان کو بتایا۔ ان کے چہرے کے تاثر سے کسی خوف اور پریشانی کا اظہار نہیں ہوا اور انہوں نے خاموشی کے ساتھ اپنا سر ہلایا۔ میں پریشان تھا اور کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ میں نے ان سے کہا "آپ عوام کو آواز کیوں نہیں دیتے کہ وہ کھڑے ہو جائیں۔ یا پی پی پی کے قائدین سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ آپ کی جانب سے عوام سے کہیں کہ وہ سڑکوں پر نکل آئیں" انہوں نے خلاء میں نظر جماتے ہوئے کہا "پی پی پی کے رہنماؤں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں عوام کو پکارنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے بھول جاؤ اور میری فکر نہ کرو یہ میرے شایان شان نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری خاطر سڑکوں پر نکل آئیں اور اپنی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں۔ زندگی بڑی قیمتی چیز ہے لیکن دوسروں کی عزت اور جان کی قیمت پر نہیں۔ ان کی یہ پیش کش یقیناً نیم دلانہ تھی ورنہ ان کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر وہ واقعی کچھ کرنا چاہتے تھے تو ان کو کر لینا چاہئے تھا۔ میں موت کی کوٹھڑی سے ان کو کیا ہدایات دے سکتا ہوں۔ افسوس کہ وہ بچوں کی طرح مجھ سے پوچھنے آئے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ بات یہیں ختم ہو جائے اور میں نے ان سے کہا "پھر آپ مجھے اختیار دیں کہ عوام کو بتاؤں کہ یہ آپ کی ہدایات ہیں"

انہوں نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور کہا "اب کیا فائدہ! میں نے اپنے آپ کو موت

www.bhutto.org

کے لئے تیار کر لیا ہے"

"ٹھیک ہے! جو کچھ بھی ہو لیکن یہ آپ کا حق ہے اور آپ کو اسے استعمال کرنا چاہئے" میں نے ان سے کہا۔

انہوں نے جواب "ٹھیک ہے! تم ان سے اشارتاً یہ بات کہہ دو کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے قائد کے لئے لڑیں ان کو یہ بھی بتا دو کہ بھٹو کے ذہن میں اپنی جان بچانے کا ارادہ بالکل نہیں ہے لہٰذا وہ یہ نہیں کہیں گے کہ عوام اپنی جان خطرے میں ڈال دیں۔"

نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنے چچا سے بحث کرتا رہوں اور میں نے ان سے تقریباً گستاخانہ انداز میں کہا "یا تو میں واضح طور پر ان سے کہوں گا کہ یہ آپ کی ہدایات ہیں یا پھر کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اگر میں نے کوئی مبہم بات کی تو وہ اس کو اپنے معنی پہنائیں گے" انہوں نے پھر چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اس پر بہت خوش ہوں کہ تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ وہ عوام کو بتائیں کہ یہ میری ہدایات ہیں۔ لیکن پہلے سہالہ جا کر بے نظیر اور اپنی چچی سے ملو اور ان کو بتاؤ کہ پارٹی کے لئے میری کیا ہدایات ہیں"

اس کے بعد ہم دونوں نے دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے چند خاص پیغامات کا تبادلہ کیا۔ مجھے دوسرے دن لندن پرواز کرنا تھا کیونکہ چند پیغامات پہنچانے تھے۔ خاص طور پر جو "میر" کے لئے تھے بڑے حساس اور اہمیت کے حامل تھے اور جس پر بروقت عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی ہم اس تذبذب میں تھے کہ یار محمد نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے تیس منٹ ختم ہو چکے ہیں۔ شہید نے اپنی ایک انگلی اوپر اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا صرف ایک منٹ! صرف ایک منٹ اور" یار محمد نے دونوں بازو ملا کر اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ٹھیک ہے" یکایک شہید جھنجلا کر کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور لات مار کر کرسی کو ایک طرف پھینک دیا اور چیخ پڑے "طارق چلے جاؤ میں اس شخص کا احسان لینا نہیں چاہتا۔ میں اب بھی ملک کا منتخب وزیراعظم ہوں اور ان لوگوں سے کوئی مہربانی نہیں چاہتا" یہ کہتے ہوئے انہوں نے الوداعی انداز میں میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ ہماری وہ ملاقات آخری ثابت ہوئی۔ پھر کبھی نہ ملنے کے لئے۔

دوسری صبح میں مقدمہ کے کاغذات لے کر لندن چلا گیا اور میر (مرتضیٰ) اور شاہ (شاہنواز) کے پاس پہنچا تاکہ فوری طور پر عالمی منصفوں کی کانفرنس کا انتظام کر سکوں۔

www.bhutto.org

3 راپریل کی رات میں میراور شاہ کے ساتھ ان کی رہائش گاہ پر کافی رات تک رکا رہا۔ اس دوران کچھ ایسی امید افزا خبریں موصول ہوئیں جس سے ہمیں کچھ اطمینان اور سکوں ملا جو ایک طویل عرصہ سے نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے فلیٹ پر واپس آ گیااور ایک پرسکوں رات گزارنے کی امید پر دو بجے رات کو سو گیا۔ کوئی ساڑھے تین بجے صبح ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے بیدار کر دیا۔ نیم خوابی کی حالت میں میں نے رسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے میر بول رہے تھے"انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو مار دیااور ساتھ ہی ہم سب کو بھی"۔

کسی بھی جگہ کوئی ایسا غریب بچہ نہ تھا جس کی آنکھوں سے آنسو رواں نہ ہو گئے ہوں۔ ۴ر اپریل کی صبح کو ہم نے قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کی۔ ذوالفقار علی بھٹواب کبھی ہمارے ساتھ نہ ہوں گے۔ میرے چچا مسٹر بھٹو چلے گئے لیکن وہ ایک تاریخ چھوڑ گئے ہیں اب ان کی آواز سنائی نہیں دے گی لیکن جیسا کہ انہوں نے پیش گوئی کی تھی۔ ان کے اوپر لکھی ہوئی نظمیں اور گیت پاکستان کے کونے کونے میں گائے جاتے ہیں جہاں غریب بستے ہیں۔ ان کی یادیں تاریخ کے جگمگاتے ہوئے شیش محل میں ایک مقدس یادگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ٹینک یا فوجی جوتے اس میراث کو نہیں کچل سکتے جو لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہو۔ بھٹو اس سرزمین کی خوشی اور غم تھے۔ ان کی روح ان لاتعداد ارواح میں شامل ہو گئی ہے جو ان کے لئے روتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں۔ وہ ان کو واپس تو نہیں لا سکتے لیکن ہر دھڑکن کے ساتھ ان کا نام انکے دلوں میں گونجتا ہے اور ان کی پرنم آنکھوں میں شہید کے چہرے، کا عکس نظر آتا ہے جو ان کے غصے اور شرمساری کا اظہار ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو ایک مقناطیسی طاقت رکھتے تھے جو انہوں نے عوام میں منتقل کر دی تھی۔ وہ عوام کی رگوں کو چھو کر ان میں بے تحاشہ خوشی یا غصے کی جذبات ابھارنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ عوام کی نبض ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی وہ انہی کے ساتھ ہنستے اور روتے تھے۔ وہ عوام سے محبت کرتے تھے اور عوام ان سے۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں۔

"میرا سب سے بڑا معاشقہ عوام کے ساتھ ہے"

مظلوم اور نجات دہندہ کو متحد اور اتنے موثر انداز میں بجلی کی سی قوت کے ساتھ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری نے حقیقت کا روپ دھار لیا ہے۔ وہ ان کے لئے کبھی نہیں مریں گے اور بھلائے نہ جائیں گے اس کے لئے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس لئے بھی کہ شہید میرے چچا تھے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

ابتدائی دور

عمر قریشی

4 راپریل 1979ء کو میں لندن میں تھا۔ صبح صبح فون کی گھنٹی بجی، اتنی صبح ٹیلی فون کی گھنٹی عام پر طور کسی ہنگامی صورت حال کی علامت ہوتی ہے۔ دوسری طرف سے ایک دوست کی آواز آئی "ریڈیو کھولو" اس جملے میں حکم نہیں بلکہ درد کی تکلیف تھی اور اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ میں نے بستر کے قریب رکھے ہوئے ریڈیو کو آن کیا اور گھنڈی کو ادھر ادھر گھمایا۔ بی بی سی سے خبریں آ رہی تھیں۔

"پاکستان میں مسٹر بھٹو کی سزائے موت پر عمل در آمد کر دیا گیا ہے" بے یقینی غصے میں تبدیل ہوئی اور پھر غصہ ٹھنڈا ہو کر غم بن گیا۔

میرا عزیز ترین دوست مر چکا تھا۔ وہ ہمارے ملک کا منتخب وزیر اعظم تھا۔ وہ میرے لئے ایک بہت ہی منحوس لمحہ تھا اور آنے والے نتائج کا تصور بھی بہت خوفناک تھا۔

میں جانتا تھا کہ بار بار فون کی گھنٹیاں بجیں گی اور بجتی رہیں گے۔ ذاتی غم ایک عوامی سانحہ بن جائے گا۔ میں اور میری بیوی کچھ سکون حاصل کرنے کے لئے نیو گارڈنز چلے گئے۔ اپریل ایک ایسا مہینہ ہے جب موسم تبدیل ہوتا ہے اور پھول پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے پتے سرسبز ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ایک قسم کا سکون پہنچاتے ہیں۔

www.bhutto.org

میں اور ذوالفقار علی بھٹو کافی عرصہ ایک ساتھ رہے اور اگر وہ زندہ ہوتے تو ہماری دوستی کی نصف صدی مکمل ہو چکی ہوتی ہم دونوں کیتھڈرل اسکول بمبئی میں تعلیم حاصل کرتے تھے ہم دونوں کرکٹ کھیلنے کے بہت شوقین اور حقیقتاً ہماری دوستی کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ ہم مسلمانوں کو پینٹاگلر (Pentagular) میں کھیلتا دیکھنے کے لئے کلاس چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ان کی جیت پر ہم جشن مناتے اور شکست پر افسوس کیا کرتے تھے۔ اس وقت ہماری یہ آرزو تھی کہ ہم کرکٹ کے اعلیٰ درجہ کے کھلاڑی بنیں ہم ولنگڈم (Willingdom) کلب میں اسکوائش بھی کھیلتے تھے۔ ہم دونوں سینما بھی دیکھا کرتے تھے۔ وہ این شیریڈاں کا دلدادہ تھا اور میں "ایلسٹھر ولیز" کا لیکن گیری کوپر ہم دونوں کی مشترکہ پسند تھا۔ ہمارے خاندان آپس میں دوست تھے اور ایک دوسرے کے گھر اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ان کا مکان دورلی میں ساحل سمندر کے قریب تھا اور ہمارا مکان بھی ساحل سمندر پر شیواجی پارک میں تھا۔ ہمارا لڑکپن بھی بڑا عجیب تھا۔ خوش و خرم اور فکروں سے بے نیاز۔ ہمارے لئے صرف ایک چیز افسوس کا باعث بنتی تھی جب بارش کی وجہ سے کرکٹ میچ ختم ہو جاتا تھا۔

تعلیم کے سلسلے میں جب ہمارا بیرون ملک جانے کا وقت آیا۔ اس وقت بھی ہم دونوں جنوبی کیلیفورنیا یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اور مسز بیس جونز (Mrs.Bess Jones) کے ہوسٹل میں کمرے کے ساتھی بنے۔ یہ ہوسٹل جیفرسن بلیوارڈ میں جنوبی فلاور اسٹریٹ پر واقع تھا۔ یہ ایک نرالے قسم کا مہمان خانہ تھا۔ مسز جونز ایک مریضہ تھیں لیکن ہم نے کبھی ان کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ کبھی ہم کو کرایہ ادا کرنے میں دیر ہو جاتی جو پانچ پونڈ فی ہفتہ تھا تو مسز جونز ہمارے کمرے کے دروازے کے نیچے سے یاددہانی کی ایک چٹ ڈال جاتی تھیں۔ ہم ان کو زر مبادلہ کے حصول کی پیچیدگیوں سے آگاہ کرتے لیکن وہ ہماری بات کو نہیں سمجھ پاتی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے کبھی کمرہ خالی کرنے کی دھمکی نہیں دی۔

ہم دونوں نے مشترکہ طور پر "دی اسمائلنگ آئرش مین" کے کباڑ خانے سے ایک پرانی "نیش" (Nash) کار خریدی۔ میرے ذہن میں (The Smiling Irish man) کا نام اس وقت سے تھا جب ان سے پوچھا گیا تھا کہ کیا رچرڈ نکسن بھی ان سے پرانی کار خریدنا پسند کریں گے۔ وہ کار ہمارے لئے ایک کڑوی گولی بن گئی۔ ہم اس کو دوبارہ بیچ نہ سکے بلکہ اس سے نجات ہی حاصل کر لی۔

لاس اینجلس میں ہم نے بمبئی کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی کام کیا۔ ہم اپنی عمر سے زیادہ بڑوں کی طرح باتیں کرتے تھے اور ہمارے امریکی دوست کہا کرتے تھے۔ کہ ہم اپنی عمر کے لحاظ

www.bhutto.org

سے نمایاں طور پر زیادہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات تھی۔ دراصل اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے ہم مطالعہ کا زیادہ شوق رکھتے تھے، اور ہمارا مطالعہ اخبارات میں صرف لطائف کے کالم تک محدود نہیں تھا۔ ہم یونیورسٹی کی تمام سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ ہم وہاں کی مباحثہ ٹیم کے بھی رکن تھے۔ فٹ بال کے موسم میں ہر سنیچر کو پابندی سے فٹ بال کھیلنے جاتے تھے اور اتوار کے دن "گرنیتھ پارک" میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ وہاں کرکٹ کا معیار بہت پست تھا اور ہم اپنی ٹیم "کوریتھین" کے سپر اسٹارز تھے۔ اور شوقیہ میچ کھیلنے کے سلسلے میں ہم نے تقریباً سارے کیلیفورنیا کی سیر کر لی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے محافظ تھے لیکن میں عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے اس کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ ہماری دوستی کوئی معمولی دوستی نہیں تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ ملک کے صدر اور وزیراعظم بنے اس وقت بھی ہم دوست سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم ہر بات پر ایک دوسرے سے اتفاق کرتے کیونکہ یقیناً میں دوسروں کی سوچ کا تابع نہیں تھا۔ اجتماعی مواقع پر میں ان کو ان کے بلند مرتبہ کے مطابق عزت و احترام دیتا تھا۔ اور جب صرف ہم دونوں تنہا ہوتے تھے تو وہ میرے لئے صرف "زلفی" تھے۔ اگرچہ یہ مؤدّب طریقہ نہیں لیکن اس سے محبت اور خلوص کا اظہار ہوتا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نوجوانی میں کیسے تھے؟ یہ سوال مجھ سے اکثر کیا جاتا ہے۔ اور میں نے ہمیشہ اس کا یہی جواب دیا ہے کہ وہ کسی بھی دوسرے نوجوان کی طرح تھے جو زندگی سے محبت کرتے تھے۔ عام طور پر بہت واضح اور غیر پیچیدہ لیکن بعض مواقع پر تاخیر سے کام لینے والا۔ وہ ایک اچھے دوست تھے لیکن میرے خیال میں وہ ایک دشمن بھی تھے۔ وہ اپنی پسند اور ناپسند میں بہت غصیلے تھے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ سخت گیر تھے جن کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کے نظریات بہت مضبوط تھے اور وہ ان لوگوں سے بہت دلبرداشتہ ہوتے تھے جو ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہو کہ وہ سیاسی عزائم رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے مجھ سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں ان کی حوصلہ شکنی کروں گا۔ میرے نزدیک سیاست ایک ایسی گلی تھی جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ انہوں نے بھی مجھے کبھی سیاست میں آنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری دوستی ایک مضبوط نوعیت کی تھی۔ بہرحال مجھے یاد ہے کہ "پیلو مودی" نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک دن پاکستان کا وزیراعظم بنے گا۔ حالانکہ ان کے اندر یکسوئی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسی علامت ظاہر ہوتی تھیں کہ وہ اس بے مقصد خواہش کی طرف جائیں گے۔ بعد میں جب وہ وزیر خارجہ بنے تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا "میرا جی چاہتا ہے

www.bhutto.org

کہ میں اقوام متحدہ میں پاکستان کا سفیر بنوں" ان کی سیاسی منصوبہ بندی کیا تھی؟ میرا خیال ہے کہ وہ اپنے مرکز سے ہٹنے لگے تھے۔ ہم سب کی طرح وہ نو آبادیاتی نظام کے سخت خلاف تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ جس پر وہ سنجیدگی سے سوچتے تھے وہ "اسرائیل" تھا۔ وہ طلباء یونین کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ جاتا اور اسرائیل پر سخت تنقید کرتا تھا۔ اسرائیل کو امریکہ کی مدد کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا "یہ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ نہیں بلکہ "جیونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ ہے" وہ عرب اور جبرانیوں کے خلاف نہیں تھا۔ کبھی کبھی ہماری یونیورسٹی میں کوئی مقتدر سیاسی شخصیات دورہ کرتی تھیں۔ ہرٹ ہمفرے کی طرح نکسن بھی وہاں آئے۔ ہمفرے ایک عظیم اور مکمل سیاستدان تھا اور اپنے اوپر لگی ہوئی چھاپ کہ وہ بائیں بازو سے تعلق رکھتا تھا۔ مٹانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک غیر نظریاتی، نئی اور صاف ستھری فلاحی مملکت پر یقین رکھنے والا جمہوریت پسند قرار دیا۔ ہمفرے کے اس نظریئے نے ذوالفقار علی بھٹو پر گہرا نقش چھوڑا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا سوشلزم اسی طرح کا تھا۔ اس کا ذہن آسانی سے کسی عقیدے یا نظریئے کو قبول نہیں کرتا تھا۔ ہم دونوں پاکستان کے متعلق طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔ ہم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ پاکستان سے غربت اور سماجی ناانصافی کو ختم کر دیں گے۔ ایک جملہ جس سے وہ بہت متاثر تھا اور اکثر اس کا حوالہ دیا کرتا تھا۔ "ہر آنکھ کا ہر آنسو پونچھ ڈالیں گے۔"

اس کے بعد وہ برکلے چلا گیا اور میں جنوبی کیلیفورنیا یونیورسٹی میں ہی رہا۔ لیکن ہمارا آپس میں رابطہ قائم رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ پیلو مودی اور وہ میرے پاس آ جاتے تھے یا میں ان کے پاس برکلے چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد بھٹو آکسفورڈ چلا گیا اور ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔ لڑکپن خوابوں کی طرح گزر گیا۔ وہ ایک قیمتی دوست تھا اور وہ دن بہت اچھے تھے۔ برسات کے دن میدان اور کرکٹ۔

www.bhutto.org

بااصول قانون داں

جی ایم عباسی

یہ میرے ذہن میں یکایک ابھرنے والی ذاتی نوعیت کی یادداشتیں ہیں جو شاید پہلی مرتبہ پیش کی جارہی ہیں۔ یہ ایک لافانی دوستی کی داستان ہے۔ جس میں دوپر خلوص دوستوں کے درمیان تعلق اور قیمتی یادیں بیان کی گئی ہیں جن کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے اور میری خواہش ہے کہ اس میں وہ تمام اصحاب بھی شریک ہو جائیں جو میرے مرحوم دوست ذوالفقار علی بھٹو کی ابتدائی زندگی کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ جس نے کرہ ارض کے اس خطے میں ایسے لافانی اور امتیازی نشانات چھوڑے ہیں جن کو افسوسناک طریقہ پر گرد کی تہہ میں دبا دیا گیا ہے۔ ان کا انجام یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ انصاف کے تقاضے کسی اور طریقے سے بھی پورے کئے جا سکتے تھے۔ بہرحال میری یہ خواہش تھی کہ میں ان کے ابتدائی دور کے چند خاص اور دلچسپ واقعات لکھوں جو اب تک منظر عام پر نہیں آئے۔ مزید واقعات اور حالات جو محدود ذرائع پر منحصر ہوں گے پھر کسی وقت تفصیل سے بیان کروں گا۔ اس وقت تدوین کار/مولف کی خواہش پر کہ وہ منتخب واقعات جن کا تعلق ان کی ابتدائی زندگی سے ہو اور جو پہلے شائع نہ ہوئے ہوں اس کتاب میں شمولیت کے لئے کافی ہوں گے پیش ہیں اور محدود ہیں۔

www.bhutto.org

قانون دانی میں شمولیت

میں بیرسٹر "ڈنگومل رامچندانی" کے قانونی ادارے میں تقریباً تین سال سے یعنی نومبر 1950ء کی ابتدا سے ایک سینئر وکیل کے طور پر کام کر رہا تھا اور میں نے اپنے لئے دیوانی قانون کا شعبہ منتخب کیا تھا۔ اگر میری یادداشت صحیح ہے تو وہ جولائی ۱۹۵۳ء کا مہینہ تھا میں اپنے کمرے میں کام میں مصروف تھا۔ میرے سینئر نے جو بہت آہستہ بولتے تھے اور اپنے شدید جذبات کا اظہار کرتے ہوئے غیر متوقع طور پر تقریباً چیخ کر آواز دی اور اپنے کمرے میں آنے کو کہا۔ (حالانکہ ضرورت پڑنے پر وہ خود میرے کمرے میں میرے پاس آتے تھے۔) جیسے ہی میں ان کے سامنے پہنچا انہوں نے کہا "عباسی دیکھو یہ کون آیا ہے! میرے پیارے بھائی سرشاہنواز بھٹو کا بیٹا "زلفی" اور پھر وہ تقریباً ہکلانے لگے جیسے وہ ان کا اصل نام صحیح بولنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ قبل اس کے کہ وہ اس میں کامیاب ہوتے اور اپنی خفت مٹاتے ان کے بھائی کے بیٹے بیچ میں بول پڑے "ذوالفقار علی"

مسٹر ڈنگومل نے بڑی زوردار آواز میں لفظ "یس" بڑا لمبا کر کے بولتے ہوئے کہا "ہاں میرا مطلب ہے، ذوالفقار علی خان" اور پھر ایک محبت بھرے انداز میں بتایا سر صاحب اس کو اسی نام سے پکارتے تھے۔"

بات جاری رکھتے ہوئے مسٹر ڈنگومل نے کہا "تم جانتے ہو عباسی! یہ آکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے اور بیرسٹر ہے۔ یہ ہمارے دفتر میں کام کرے گا تم اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور دیکھو یہ تمہارے ساتھ رجسٹرار او ایس کے پاس جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے چھاگلہ" اس کے بعد مسٹر ڈنگومل رک گئے شاید یہ سوچنے کے لئے کہ اور کیا کہا جائے۔ ان خالی لمحات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اس نئے آنے والے کا جائزہ لینا شروع کر دیا کیونکہ مجھے اس سے تین سال سینئر ہونے کی وجہ سے تھوڑا سا احساس برتری پیدا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ انہوں نے بڑے پرجوش طریقہ پر ایک پروقار ایتھلیٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ پورے طور پر آگے بڑھایا اور اپنا سیدھا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور پھر ہمارے ہاتھ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ انہوں نے "آر/۵۲ ڈک کاٹن کی سفید پتلون اور گہرے نیلے رنگ کی بلیزر کا کوٹ پہن رکھا تھا جس کے پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ چابیوں کی زنجیر کا ایک سرا ان کی پتلون کے کندے میں اٹکا ہوا تھا اور چابی والا سرا ان کی جیب میں تھا۔ یہ تمام چیزیں ان کے پانچ فٹ اور دس انچ لمبے جسم پر بہت جچ

www.bhutto.org

رہی تھیں۔ ان کے خوبصورت خدوخال میں سب سے زیادہ نمایاں ان کا چوڑا ماتھا تھا۔ بالکل سیاہ بال جن کو پیچھے کی طرف بڑے احتیاط اور سلیقے سے سنوارا ہوا تھا۔ اس طرح کہ ان کے سر کے دونوں اطراف میں ایک یکسانیت پیدا ہو گئی تھی اور اتنی خوبصورت بن گئی تھی کہ کسی آرائش گیسو کرنے والے کا کمال نظر آتی تھی۔ میں ابھی ان کا جسمانی جائزہ ختم ہی کر پایا تھا کہ مسٹر ڈنگومل نے خاموشی کو توڑا اور نہایت مشفقانہ انداز میں ذوالفقار علی خان کو نصیحت کی "دیکھو ذوالفقار اب تم عباسی کے ساتھ رہو گے۔ اگر کبھی میری ضرورت ہو تو کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تم صرف آدھا دروازہ کھول کر میرے پاس آ سکتے ہو" (یہ عزت اور رعایت مجھے بھی دی گئی تھی لیکن ملازمت کے تقریباً تین ماہ بعد)۔

اس کے بعد مسٹر ڈنگومل میرا ذوالفقار علی خان سے مزید تعارف کرائے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے شاید اپنے کام کے سلسلے میں آئندہ اقدام کے لئے لائحہ عمل سوچ رہے تھے۔ اس طریقہ پر ذوالفقار علی خان نے اپنا مختصر سفر اپنی منزل کی جانب شروع کیا اور اس طرح ہمارا ساتھ ہوا جو جلد ہی دوستی میں بدل گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس وقت وہاں ان کا کوئی ذاتی دوست نہیں تھا۔ کیونکہ بمبئی میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہ امریکہ اور پھر انگلستان چلے گئے تھے اور اپنے کسی پرانے دوست کو نہیں جانتے تھے۔

بین الاقوامی نظم و ضبط کے قانون میں "سمجھوتے" ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ اور انہوں نے میرے ساتھ اپنی دوستی کی ابتداء سمجھوتے سے کی اور اعلان کیا کہ آج ہم اپنی اور اپنے دلوں کی دوستی کا سمجھوتہ ابھی اور اسی وقت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم دونوں ان کی سبز رنگ کی "جاگور" کار میں ایک چھوٹے سے ریسٹورینٹ میں گئے جس کا نام "کوالٹی" تھا اور جو وکٹوریہ روڈ (اب حاجی عبداللہ ہارون روڈ) پر واقع تھا۔

اس موقع کا جشن منانے کے لئے انہوں نے لنچ کا اہتمام کیا۔ میں جانتا ہوں ہمارا وہ سمجھوتہ ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء کو ختم ہو گیا جب ایک دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور دوسرا حفاظت کے لئے دھرتی ماں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

۱۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کو سندھ چیف کورٹ میں ان کا اندراج ایڈووکیٹ کے طور پر ہوا تھا۔ پہلے دو سال کے دوران وہ میرے ساتھ منسلک رہے اور ہماری فرم کے مقدمات کی پیروی کرتے رہے۔ ان کی بہترین رفاقت کے علاوہ مجھے ان کے بین الاقوامی قوانین کے علم سے بہت فائدہ پہنچا۔ ان کی ذہانت، تجربہ اور آکسفورڈ اور برکلے میں زمانہ تعلیم کے قصے بہت دلچسپ اور طویل تھے۔ یعنی "میامی بیچ" سے آکسفورڈ کی زندگی تک۔ ہم گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ وہ

www.bhutto.org

بولتے تھے اور میں سنتا تھا۔ میں نے جلد ہی اندازہ لگالیا کہ ان کے دماغ میں قانونی پیشے سے زیادہ سیاست بھری ہوئی ہے حالانکہ ان کے اندر ایک کامیاب قانون داں بننے کی زبردست صلاحیت موجود تھی۔ ان کا پہلا مقدمہ ایک عظیم تجربہ ثابت ہوا۔ مسٹر ڈنگومل نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ اور موکل کو مشورہ دیا کہ وہ مجھ سے ملے۔ میں نے اس کی اپیل کو پڑھا اور پھر دائر کرنے کے لئے قبول کر لیا قبل اس کے کہ اس اپیل کی سماعت شروع ہوتی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے اس کا خلاصہ تیار کرتے دیکھ لیا۔ خلاصہ تیار ہونے کے بعد انہوں نے اس کو پڑھا۔ ایک دن تک اس میں ردو بدل کرنے کے بعد انہیں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا کہ انہوں نے بذات خود اس پر عدالت میں جرح کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ پھر ہم دونوں نے دو چار دن تک اس پر اکٹھے کام کیا اور پھر مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ اسے دائر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس اپیل کی سماعت "سر جارج کانسٹنٹائن" نے کرنا تھی۔ وہ ایک سخت مزاج جج تھے۔ دوسری وجہ ان کا آئرش تلفظ تھا۔ جس کو ڈی ایس پرٹ بھی تمیزالدین خان کی پٹیشن پر جرح کرتے ہوئے نہیں سمجھ پاتے تھے۔ سماعت سے دو دن قبل ذوالفقار علی بھٹو نے مجھ سے کہا کہ میں جج سے ان کی ایک اخلاقی ملاقات کا انتظام کر دوں۔ یہ بات مجھے عجیب سی لگی لیکن پھر بھی ہم نے جج کے پرسنل سیکرٹری سے رابطہ کر کے ملاقات کا انتظام کر لیا۔ اور انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو ملنے کے لئے چار بجے شام کا وقت دیا، میں باہر برآمدے میں انتظار کر رہا تھا وہ تقریباً آدھ گھنٹہ تک جج کے چیمبر میں رہے اور جب واپس آئے تو بہت پرجوش اور خوش تھے۔ وہ میرے قریب آئے اور کہا "فکر نہ کرو ہم اپیل جیت جائیں گے" بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میں نے ان سے دریافت کیا "جج سے کیا بات ہوئی" انہوں نے جواب دیا "میں نے اپنا تعارف آکسفورڈ کے حوالے سے کرایا اور ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتایا کہ آکسفورڈ میں میرا کالج "کرائسٹ چرچ" تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی کا سب سے زیادہ بلند معیار کالج ہے۔ جہاں ایشیائی طالب علم کو بڑی مشکل سے داخلہ ملتا ہے۔ اس جج کا تعلق "کوئینز" کالج سے تھا جو معیار کے حوالہ سے "کرائسٹ چرچ" کا ہم پلہ نہیں تھا۔ لہٰذا جج اس بات سے بہت متاثر ہوا۔" دوسرے دن ہمیں کوئی کام نہیں تھا۔ بھٹو نے مجھے مشورہ دیا کہ کل ہم جارج کانسٹنٹائن کی عدالت میں چل کر بیٹھیں گے اور مقدمہ کی کارروائی سنیں گے۔ اس طرح ہماری اپنے مقدمہ کے لئے ایک ریہرسل ہو جائے گی۔ دوسرے دن ہم ساری کارروائی کے دوران کمرہ عدالت میں موجود رہے۔ جب عدالت کی کارروائی ختم ہو گئی اور جج اپنی کرسی سے اٹھنے لگے ان کی نظر ہم دونوں پر پڑ گئی۔ انہوں نے بڑے اخلاق سے بھٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

www.bhutto.org

"کوئی کام" "نہیں جناب والا! ہم صرف کارروائی دیکھ رہے تھے" ذوالفقار علی بھٹو نے جواب دیا۔ "بہت خوب" جج یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن ہماری اپیل نمبر 11 5/54 جی بھلیڈینو بنام فیض محمد۔ تیسرے نمبر پر تھی۔ پہلے دو مقدمہ ابتدائی سماعت کے بعد ہی خارج کر دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے ہم اپنے مقدمہ کے بارے میں فکر مند ہو گئے۔ مقدمہ نمبر ۳ کی طلبی ہوئی اور ساتھ ہی میرا نام ایڈووکیٹ کی حیثیت سے پیش ہونے کے لئے پکارا گیا۔ قبل اس کے کہ میں عدالت کو خود بتاتا کہ ذوالفقار علی بھٹو اس مقدمہ میں جرح کریں گے بھٹو خود کھڑے ہو گئے اور جج سے مخاطب ہو کر کہا "جناب والا! میری خواہش ہے میری پیشہ ورانہ زندگی کی پہلی پیشی جناب والا کے سامنے ہو" "کیا آپ کے پاس مختار نامہ ہے" سر جارج نے آہستہ سے دریافت کیا۔ "جی! جناب والا۔ ان کے پاس مختار نامہ موجود ہے" میں نے عدالت کو مطلع کیا۔

"ٹھیک ہے! ذوالفقار علی بھٹو آپ کارروائی شروع کر سکتے ہیں"

"جناب والا! ہم دونوں ایک ہی وکٹ پر ہیں"

"سوری" جج نے کہا۔ (شاید وہ پوری طرح سمجھ نہیں سکے کہ کیا کہا گیا ہے)

میں نے بھٹو کا گاؤن کھینچا اور کہا "سب پر لعنت بھجو" صرف فیصلہ پڑھو

"جناب والا! آپ کی اجازت سے میں فیصلہ پڑھنا چاہتا ہوں"

"آپ پڑھ سکتے ہیں" جج نے کہا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اس متنازعہ فیصلہ کو آدھا ہی پڑھا تھا کہ جج نے کہا "یہ دوسری اپیل ہے قانون کی ایک ہی غلطی کی نشاندہی کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں نے آپ کی اپیل کی بنیاد پر غور کر لیا ہے اور اپیل منظور کئے جانے کے قابل ہے۔ جج کا یہ مشاہدہ سن کر میں فوراً کھڑا ہو گیا اور ذوالفقار علی بھٹو سے آہستہ سے کہا "اسٹیٹس کوؤ! اسٹیٹس کوڈ" (Status Quo! Status Quo)

جج نے ہماری بات سن لی اور کہا "مسٹر بھٹو! آپ شاید (Status Quo) چاہتے ہیں"

"جی حضور والا" مسٹر بھٹو نے جواب دیا۔

"منظور ہے" جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ہم نہایت خوشی کی حالت میں صرف دس منٹ کے اندر کمرہ عدالت سے باہر آ گئے۔ اور وکلاء کے کمرے میں چلے گئے۔ جب مسٹر بھٹو نے اپنا گاؤن اتارا (اس زمانے میں کمرہ عدالت میں گاؤن پہننا ضرور ہوتا تھا) تو میں نے دیکھا کہ ان کی سفید پتلون پر دائیں ران کے عین اوپر کچھ لکھا

www.bhutto.org

ہوا ہے۔ اس طرح کہ کرسی پر بیٹھنے سے نظر آئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ ایک طرح کی یادداشت تھی اور لکھا ہوا تھا "ایس۔ ۱۰۰۔ سی پی سی ایس ۹۱ ای ایکٹ وغیرہ" میں نے ان (بھٹو) سے کہا "پہلے ہی مقدمہ میں نقل بازی" اور پھر ہم دونوں ہنس پڑے۔ انہوں نے جواب دیا "یہ کم بخت سی پی سی اور گواہی کی دفعہ کے حوالہ کے لئے واقعی تجربے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کو لکھ لیا تھا"

بظاہر عدالت کے یہ دس منٹ بے وقعت محسوس ہوں لیکن ذوالفقار علی کے لئے اپنے پیشے میں ایک مضبوط بنیاد کی پہلی اینٹ تھی۔ جس پر انہوں نے آئندہ عمارت کی بنیاد رکھی اور اس نے ان کے اندر بڑا اعتماد پیدا کیا۔ اس موقع پر ہم نے "بیچ لگژری" ہوٹل میں اعلیٰ درجہ کا ڈنر کھا کر خوشی منائی۔ اور اس کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہم دونوں نے مل کر کئی مقدمات کی پیروی کراچی سے باہر بھی کی۔ اپنے طور پر ہر مقدمہ کے لئے پوری طرح تیار ہوتے اور شاید ہی ان کو کسی مقدمہ میں ناکامی ہوئی ہو۔

مسٹر ڈنگومل کے ساتھ دو سال کام کرنے کے بعد انہوں نے اپنا الگ دفتر کھول لیا۔ جو مسٹر ڈنگومل کے دفتر کے ساتھ اور اسی منزل پر تھا۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے مسٹر دوراب پٹیل کو بھی اپنے دفتر میں جگہ دیئے رکھی (جنہوں نے بعد میں سپریم کورٹ کے جج تک ترقی کی) جب تک انہوں نے اپنا الگ دفتر قائم نہیں کر لیا۔

اس دفتر نے ان کے لئے ایک پیشہ ورانہ دفتر سے زیادہ اپنے سیاسی منصوبوں کے لئے ایک تحقیقی مرکز کا کام کیا۔ جب ۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا نے اپنے ہی وزیراعظم ملک فیروز خان نون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو اس کابینہ میں شامل کئے گئے جس کے سربراہ ایوب خان تھے اور ان کو وزیر خارجہ نامزد کیا گیا تھا۔ وہ دن ان کے قانون کے پیشے کے ایک سرگرم کارکن کا آخری دن بن گیا۔

ایک قانون دان اور وکیل کے طور پر ان کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عدالت عظمیٰ میں اپنی تقریر کے مقدمہ میں نظر ثانی کی درخواست پر بذات خود جرح کی۔ ان کی پیروی، توجیہات اور متعلقہ قوانین میں مہارت کو یقینی طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ وہ قانون دان کی حیثیت سے تقریباً بیس سال سے اس پیشے سے بالکل غیر منسلک تھے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور ہمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ اپنی اپیل پر جرح کر رہے تھے ان کو سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا تھا۔ وہ بہادرانہ جنگ جو انہوں نے ماتھے پر شکن لائے بغیر لڑی، اپنے آپکو پھانسی سے بچانے کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ اس مقصد کا دفاع تھا جس کے لئے وہ

www.bhutto.org

چوتھائی صدی سے جدوجہد کر رہے تھے۔ انہوں نے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ ان پر ڈٹے رہے۔ اور اس کی خاطر اپنی زندگی کا نذرانہ تک پیش کر دیا اور اپنی روح کو صداقت کی اس بلندی تک پہنچا دیا جہاں تک کوئی بھی فانی چیز پہنچ سکتی ہے۔

ان کے قصوں اور کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے اور بغیر کسی وقفے کے جولائی ۱۹۵۳ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کے عرصے پر محیط ہے جس کے بیاں کے لئے وقت اور جگہ درکار ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ وہ سب کچھ لکھوں جو میری یاداشتیں وقتاً فوقتاً یاد لاتی رہیں گی۔

www.bhutto.org

عوامی رابطہ

حاجی نذر محمد لغاری

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے بھٹو خاندان کی خدمت کر رہا ہوں۔ پچاس سال گزر چکے ہیں لیکن سر شاہ نواز بھٹو، سکندر علی خان بھٹو اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کی یادیں اب بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ مجھے وہ مہربانیاں اور شفقتیں بھی یاد ہیں جو وہ غریبوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

میری ابتدائی تعلیم سر شاہ نواز بھٹو کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بمبئی پریذیڈنسی میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ انہوں نے یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو اپنے یہاں ملازم رکھا اور مجھے گڑھی خدا بخش بھیج دیا تاکہ میں ان کی زمینوں کی دیکھ بھال کروں۔ اس وقت میں کراچی ریلوے پولیس میں ملازم تھا ایک مرتبہ جب سر شاہ نواز کراچی آئے تو میں ان کو سلام کرنے خان بہادر عبدالستار شیخ کے بنگلے پر چلا گیا جہاں وہ کراچی آنے پر قیام کیا کرتے تھے۔ سر شاہ نواز نے خواہش ظاہر کی کہ میں ریلوے پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دوں اور ساتھ ہی انہوں نے مجھے ایس پی ریلوے کے نام ایک خط دیا۔ میں نے فوراً استعفیٰ دے دیا اور گڑھی خدا بخش روانہ ہو گیا۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو اس وقت لندن میں زیر تعلیم تھے۔ ان سے میری ملاقات ۴۴ - ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی جب میں ان کے بڑے بھائی جناب سکندر علی بھٹو کے ساتھ بمبئی گیا

www.bhutto.org

تھا۔

سر شاہ نواز کا بنگلہ بمبئی میں دورلی کے علاقہ میں تھا۔ میں بنگلہ کے سبزہ زار میں بیٹھا ہوتا تھا تو ذوالفقار علی بھٹو اکثر میرے پاس آ جاتے تھے اور سندھی زبان کے مشکل الفاظ کے معنی اور مطلب دریافت کیا کرتے تھے۔ وہ بہت ہونہار تھے اور بچپن ہی سے ان کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔

نوجوانی میں وہ ہمیشہ اپنے علاقے کے لوگوں سے رابطہ رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اپنا پہلا فیصلہ اپنے نوڈیرو کے بنگلے پر کیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ ایک ڈریسر (جس کو ہمارے علاقے میں "جوہو" کہتے ہیں) کی لڑکی کو ایک اسکول ماسٹر نے اغواء کر لیا جس کا تعلق "میر بہار قبیلے" سے تھا۔ اس "جوہو" نے بھٹو صاحب سے شکایت کی۔ انہوں نے فوراً اسکول ماسٹر کو نوڈیرو طلب کیا۔ اسکول ماسٹر کو معلوم تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نہ تو انصاف کرنے میں تاخیر کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کی حمایت اور طرفداری کرتے ہیں۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے قرآن پاک اپنے ساتھ لے گیا۔ بھٹو صاحب نے بہت سختی کے ساتھ اس اسکول ماسٹر کی سرزنش کی اور اسے اس وقت تک معاف نہیں کیا جب تک خود لڑکی کے باپ نے ان سے درخواست نہیں کی کہ اسے معاف کر دیں۔ اگر لڑکی کے باپ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو بھٹو صاحب اسکول ماسٹر کو کڑی سزا دیتے کیونکہ وہ کسی کی بے عزتی برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہ فیصلہ اس وقت کیا تھا جب وہ صرف ایک طالب علم تھے۔ یہ فیصلہ عرصہ تک علاقے کے لوگوں کا موضوع سخن بنا رہا۔

بھٹو صاحب بہت کم گو انسان تھے۔ وہ بڑے خوش لباس تھے اور اپنے ملازمین کو بھی صاف ستھرا رہنے کی ہدایت کرتے تھے۔ "معمولی کپڑے پہنو لیکن یہ خیال رکھو کہ وہ دھلے ہوئے اور صاف ہوں" اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ اس بات پر مسلسل توجہ دیتے تھے کہ بھٹو خاندان کے ملازمین صاف ستھرے رہا کریں۔ وہ اپنے ملازمین کے کپڑے خود بنواتے تھے وہ اکثر مقررہ تنخواہ کے علاوہ بھی ملازمین کو جیب خرچ دیتے رہتے تھے۔ بھٹو صاحب بہت رحمدل اور خدا سے ڈرنے والے انسان تھے۔ یہ شاید ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ لاڑکانہ کی ایک بستی میں بڑی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ فوراً بھاگ کر اس بستی میں پہنچے اور بذات خود آگ بجھانے میں حصہ لیا۔ بھٹو صاحب شہ سواری کے بھی بہت شوقین تھے۔ شکار کا بھی انہیں بہت شوق تھا اور وہ ایک بہت اچھے نشانہ باز تھے۔ میں نے کبھی ان کا نشانہ خطا ہوتے نہیں دیکھا۔ ان کے پاس اس وقت کی بہترین بندوقیں تھیں۔

www.bhutto.org

جب وہ وزیر خارجہ تھے تو انہوں نے اپنی زمینوں پر جدید طرز پر کاشت کاری شروع کر دی جس کے شاندار نتائج نکلے۔ وزیر ہونے کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہتے تھے لیکن عیدین کے مواقع پر وہ نوڈیرو ضرور پہنچ جاتے تھے۔ عید کے موقع پر وہ نہ صرف آنے والوں کا خیر مقدم کرتے تھے بلکہ ان کے مسائل بھی معلوم کرتے تھے۔ اور ان کے حل کے لئے موقع پر ہی ہدایات جاری کرتے تھے۔ میں ان کی یادداشت اور ذہنیت کے سینکڑوں حوالے دے سکتا ہوں لیکن اس وقت ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔

"المرتضٰی، میں, سفر، نام کا ایک ملازم تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے وہ ملازمت چھوڑ دی اور موٹر ڈرائیور بن گیا۔ کئی سال گزرنے کے بعد ایک مرتبہ بھٹو صاحب لاڑکانہ آئے تو انہوں نے ملازمین سے دریافت کیا کہ سفر کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا کہ وہ "سفر" کو تلاش کریں۔ ڈپٹی کمشنر کے آدمی جب بس اسٹینڈ پر سفر کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید اس سے کوئی جرم ہو گیا جس کی وجہ سے اسے طلب کیا گیا ہے۔ سفر کے آنے پر شہید نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کی خیریت وغیرہ دریافت کی۔ انہوں نے سفر سے اس کی بیوی کے بارے میں پوچھا کہ کیا وہ ابھی حیات ہے۔ سفر نے مثبت جواب دیا۔ بھٹو صاحب نے سفر سے کہا کہ وہ اب کافی بوڑھا ہو گیا ہے اور اسے کوئی سخت مشقت کا کام نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کو اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلا جانا چاہئے اور ساتھ ہی دونوں کے حج کے اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ سفر خوشی اور احسان مندی کے جذبات سے کانپنے لگا۔ اس نے بھٹو صاحب کے پاؤں چھوئے اور ان کو دعائیں دینے لگا۔ ان ہی دنوں انہوں نے "المرتضٰی" کے نگراں تاج محمد اور دوسرے غریب لوگوں کو حج کے لئے بھیجا۔ شہید جب بھی لاڑکانہ آتے تو اپنے آبائی قبرستان ضرور جاتے تھے وہ اپنے بزرگوں پر دادا خدا بخش بھٹو اور داد غلام مرتضٰی بھٹو کی قبروں پر جا کر فاتحہ خوانی کرتے تھے۔ جب وہ وزیر اعظم تھے تو پابندی سے اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتے تھے۔ وہ میر نبی بخش خاں بھٹو کا بھی بڑا احترام کرتے تھے اور اکثر ان سے ملنے جاتے رہتے تھے۔

بھٹو شہید بڑے فراخدل انسان تھے۔ ان کی عالی ظرفی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایوب خان کی کابینہ سے مستعفی ہونے کے بعد ان کے تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایوب کی تصویر کو جو "المرتضٰی" میں آویزاں تھی اس کی جگہ سے ہٹایا نہیں۔

وہ بے انتہا ہمدرد انسان تھے۔ ۱۹۷۶ء میں جب میں گڑھی خدا بخش میں تھا تو حادثاتی طور پر پستول چل گیا اور میں زخمی ہو گیا۔ مجھے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ شہید اور ان کی بیگم صاحبہ کو

www.bhutto.org

اطلاع دی گئی۔ انہوں نے فوراً تفتیش کرنے والے افسر لو بلایا اور اس واقعہ کے حقائق معلوم کرنے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ہسپتال کے عملے کو بھی ہدایت کی کہ وہ میرے علاج پر خصوصی توجہ دیں۔ دوسرے دن وہ مجھے دیکھنے کے لئے لاڑکانہ آئے اور تقریباً آدھ گھنٹہ تک میرے پاس رہے۔ ان کی آمد کی وجہ سے ہسپتال کے عملے نے میرے علاج اور دیکھ بھال پر خصوصی توجہ دی اور میں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ ان کی خوبیاں بیان کروں۔ بس یوں سمجھئے کہ قائدانہ صلاحیتیں، خلوص، محبت اور تدبر سب کے سب ایک شخصیت میں سما گئے تھے۔ ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء قومی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا۔ یہ وہ دن تھا جب ہم سب زندہ درگور کر دیئے گئے تھے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ان کی صاحب زادی اور بیگم نصرت بھٹو صاحبہ کی سرپرستی حاصل ہے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب ایک عظیم مجاہد کو مردہ حالت میں لایا گیا تھا۔ ۴ر اپریل ۱۹۷۹ء کو میں اپنے مکان میں سو رہا تھا۔ صبح تین بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں نے گاؤں کے باہر پچاس ساٹھ فوجی گاڑیوں کی چمکتی ہوئی بتیاں دیکھیں۔ پہلے میں سمجھا کہ شائد وہ ان اقدامات کی ریہرسل کر رہے ہیں جو بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد کے حالات سے نمٹنے کے لئے کئے جائیں گے جیسا کہ وہ دو دن پہلے بھی کر رہے تھے اور ظاہر یہ کر رہے تھے کہ معمول کی فوجی مشقیں تھیں۔ تمام لوگ خوفزدہ تھے خاص طور پر اس وقت جب پولیس بھٹو صاحب کے آبائی قبرستان میں داخل ہوئی اور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ پولیس والوں نے جب اتنی صبح مجھے گھر سے بلایا تو قصبے کے تمام لوگ بوڑھے، جوان، عورتیں اور مرد سب اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ سب کو یہی خدشہ تھا کہ یا تو بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی ہے یا جلد ہی دی جانے والی ہے ان سب کے چہروں پر بے چینی اور آنسو تھے۔ فوجیوں اور پولیس والوں نے ہم سے کہا کہ انہیں وہ جگہ بتائی جائے جہاں بھٹو صاحب کو دفن کرنا ہے۔ میں نے روتے ہوئے کہا "ہم کیوں بتائیں کہ کہاں دفن کرنا ہے۔ ہم خود ان کی آخری رسومات پوری کریں گے، بھٹو ہمارا ہے"

میں نے فوجیوں سے یہ بھی کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم اپنے آدمی لے کر آئیں تاکہ وہ قبر کھودیں۔ اینٹیں اور لکڑی کے تختے وغیرہ لے کر آئیں اور اپنی مذہبی دعائیں وغیرہ پڑھیں۔ فوجیوں نے ہماری مدد کے لئے صرف آٹھ آدمیوں کی اجازت دی۔

جس وقت ہم اس غم ناک کام میں مصروف تھے۔ فوج اور پولیس نے نہ صرف پورے قصبے کو گھیرے میں لیا ہوا تھا بلکہ ہر چھوٹی بڑی سڑک اور گلی کو بند کر دیا تھا تاکہ نہ کوئی قصبے سے باہر جا

www.bhutto.org

سکے اور نہ باہر سے قصبے میں داخل ہو سکے۔ ہمارا رابطہ پورے علاقے سے منقطع کر دیا گیا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب دو ہیلی کاپٹر قصبے کے قریب ایک سڑک پر اترے جہاں ایک ایمبولینس ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے تابوت کو ہیلی کوپٹر سے ایمبولینس میں منتقل ہوتے دیکھا اور اس کے ساتھ قبرستان تک گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک فوجی افسر نے قبرستان میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مکان کی طرف اشارہ کر کے اسے خالی کرنے کو کہا۔ یہ مکان قبرستان کے جنوبی کونے میں واقع ہے۔ اور اس میں نماز جنازہ پڑھانے والے امام صاحب اپنے خاندان کے ساتھ رہائش رکھتے تھے۔ میں نے اس پر احتجاج کیا کہ اس طرح امام صاحب اور ان کے بیوی بچوں کو تکلیف اور پریشانی ہو گی۔ لیکن کرنل نہیں مانا اور اس پر مصر رہا اور خالی کرا لیا۔ اس کے بعد تقریباً بیس مسلح باوردی فوجی جوان اس مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور اپنی رائفلوں کا رخ قبرستان کی طرف کر کے پوزیشن سنبھال لی۔

مرنے والے کے لواحقین کو مرحوم کا آخری دیدار ضرور ہوتا ہے۔ گڑھی میں بھٹو صاحب کے چچا زاد بھی تھے جن کی رہائش قبرستان کے قریب ہی تھی۔ بھٹو صاحب کی پہلی بیوی بھی قریبی گاؤں نوڈیرو میں رہتی تھیں۔ کافی بحث کے بعد حکام نے انہیں لانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ آ گئیں تو ہم نے تابوت کھولا اور میت کو نکال کر اس چارپائی پر رکھ دیا جو میں مکان کی چار دیواری کے اندر لے جانے کے لئے اپنے گھر سے لایا تھا ان کے خاندان کی خواتین کو پردے میں رکھا جاتا تھا تاکہ غیر مردوں کی نظر ان پر نہ پڑے۔ خاندان سے باہر کے مردوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن فوجی شائستگی کی تمام حدود کو توڑ کر زبردستی مکان کے اندر گھس آئے۔ جب تقریباً آدھے گھنٹہ کے بعد جنازے کو باہر لایا گیا تو میں نے کرنل سے قسم دے کر دریافت کیا کہ میت کو مذہبی رسوم کے مطابق غسل اور کفن وغیرہ دیا گیا تھا۔ اس نے قسم کھا کر جواب دیا کہ سب کچھ رسوم کے مطابق کیا گیا تھا۔ میں نے تصدیق کرنے کے لئے میت کو دیکھا۔ وہ واقعی بغیر سلے کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہم سب اس قدر غمزدہ اور نڈھال تھے کہ ہم ان کا پورا جسم نہیں دیکھ پائے اور مجھے یقین نہیں کہ وہ ہم کو اس کی اجازت دے دیتے کیونکہ اس طرح ان کے کرتوت ظاہر ہو جانے تھے۔ لیکن شہید کا چہرہ موتی کی طرح چمک رہا تھا اور وہ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے سولہ سال کی عمر میں تھے۔ ان کی جلد کے رنگ مختلف نہیں تھے اور نہ ہی ان کی زبان اور آنکھیں باہر آئی ہوئی تھیں۔ اس طرح جیسے میں نے ضیاء کے سرعام پھانسی پر لٹکائے جانے والے لوگوں کی تصویروں میں دیکھا تھا۔ مذہبی طریقہ کار کے مطابق میں نے بھٹو صاحب کا چہرہ مغرب (قبلہ) کی طرف موڑ دیا لیکن ان کا سر اس طرف نہیں ہوا۔ ان کی گردن بھی نوٹی ہوئی

www.bhutto.org

نہیں تھی۔ ان کے گلے پر عجیب قسم کے سرخ اور سیاہ دھبے تھے جیسے کسی سرکاری مہر کے ہوتے ہیں۔

کرنل سخت غضب ناک ہو گیا کیونکہ کوئی چودہ پندرہ سو آدمی شہید کے چہرے کا نور دیکھنے کے لئے زبردستی جنازے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی گریہ زاری سے دل بیٹھا جارہا تھا۔ کرنل نے دھمکی دی کہ اگر لوگ واپس نہ گئے تو وہ لاٹھی چارج کا حکم دے دے گا۔ وہ کہنے لگا کہ تدفین فوراً ہو جانی چاہئے ورنہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ڈنڈے کے زور پر خود کر دیں گے۔ "وہ غمزدہ اور شکستہ دل ہیں" میں نے کرنل سے کہا۔

بندوق کی نوک پر ہم نے جلدی جلدی نماز جنازہ ادا کی اور مرحوم کے لئے آخری دعا کی اور ان کے جسد خاکی کو لحد میں اتار دیا۔ قران خوانی اور مکانوں سے اٹھتی ہوئی گریہ و زاری کی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

یہ تھا شہید کا اختتام جو میں نے دیکھا۔

www.bhutto.org

فرض کی راہ میں

محمد عرس

میں نے ۱۹۷۳ء میں چودہ سال کی عمر میں بطور خدمت گار "المرتضیٰ" لاڑکانہ میں ملازمت اختیار کی تھی۔ چند دن بعد شہید بھٹو وہاں آئے اور مجھے اپنے ساتھ راولپنڈی چلنے کا حکم دیا۔ جس پر میں گھبرا گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ شہید بھٹو نے نہایت شفقت سے یقین دلایا کہ میں ان کے بچوں کی طرح ہوں اور مجھے کسی قسم کا خوف نہیں کرنا چاہئے۔ میں راولپنڈی آ گیا جہاں مجھے ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ شہید بابا اتنے شفیق تھے کہ میری ملازمت کے پہلے ہی مہینے میں روس کے دورے پر اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک دن راولپنڈی میں شہید بھٹو نے مجھے آواز دی۔ اس وقت میں ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اس لئے مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ وہ میری جگہ دوسرے ملازم بہاول کو رکھ لیں گے۔ کچھ دن بعد ہم راولپنڈی سے "المرتضیٰ" لاڑکانہ واپس آئے تو میں اپنا سامان لے کر نوڈیرو چلا گیا۔ جب شہید بابا کو میری غیر حاضری کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی کار مجھے لینے کے لئے بھیجی اور میں آ گیا۔ بعد میں چائے لے کر میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے پوچھا "کیا تم سلطان احمد چانڈیو ہو جو غصہ ہو کر چلے گئے" ان کی اس بات پر میرے ہاتھ کانپنے لگے اور چائے کے چند قطرے فائل پر گر گئے لیکن وہ محبت سے مسکرا دیئے اور نہایت شفقت سے

www.bhutto.org

کہا "ڈرو مت"

بطور وزیراعظم شہید بھٹو صاحب غیر ملکی دوروں پر مجھے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ اور جب غیر ملکی اہم شخصیات ان سے ملنے آتی تھیں تو میں ہی ان کی خدمت کرتا تھا۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں ترکی میں ہونے والی میٹنگ کے دوران شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے بھٹو صاحب کو دعوت دی کہ واپسی پر وہ ایران تک ان کے ساتھ چلیں۔ تہران کے ہوائی اڈے پر کسٹمز کے عملے نے مجھے بریف کیس کھول کر دکھانے کو کہا۔ میں نے ان کو بتایا کہ وہ بھٹو صاحب کا بریف کیس ہے۔ اور اس کے تالے کے نمبر وہی جانتے ہیں۔ اس دوران بھٹو صاحب اور شاہ ایران وہاں پہنچ گئے اور کسٹمز کے افسران ایک طرف ہو گئے۔ دوران سفر بھٹو صاحب نے مجھ سے اس واقعہ کے بارے میں معلوم کیا اور پھر شاہ سے شکایت کی کہ کسٹمز والوں کا رویہ بہت نامناسب تھا۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ خود شاہ نے ان کو مدعو کیا تھا۔ اس پر شاہ نے معذرت کی۔

اس کے بعد ہم کابل روانہ ہو گئے۔ صدر داؤد کابل کے ہوائی اڈے پر بھٹو صاحب کا خیر مقدم کرنے آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ صدر داؤد نے بھٹو صاحب کا خیر مقدم پرجوش طریقے پر نہیں کیا۔ اسی شام اپنی قیام گاہ پر میں نے بھٹو صاحب سے اس بات کا اظہار کیا۔ بھٹو صاحب مسکرا دیئے اور کہا کہ صدر داؤد سے یہ ان کی پہلی ملاقات ہے۔ دوسری ملاقات پر داؤد بالکل مختلف ہوں گے۔ اور واقعی دوسرے دن جو کچھ میں نے دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ وہ کار جس میں بھٹو صاحب آئے جب رکی تو خود صدر داؤد نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور جوں ہی بھٹو صاحب کار سے باہر آئے، صدر داؤد بڑے پرتپاک انداز میں ان سے بغل گیر ہوئے۔ بھٹو صاحب کی یادداشت بہت تیز تھی۔ لاہور کے ایک جلسے میں انہوں نے ایک ایسے شخص کو نام لے کر آواز دی جس کو انہوں نے دس سال قبل دیکھا تھا۔ مزید تعجب خیز بات یہ تھی کہ اس دوران اس شخص نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔

میں شہید وزیراعظم اور جنرل ضیاء کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کا گواہ ہوں۔ ضیاء ان سے ملاقات کے وقت اس قدر بدحواس ہو جاتے تھے کہ ان کے لئے اپنی چائے کی پیالی میں چینی ڈالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور اکثر ہاتھ کانپنے کی وجہ سے چینی چمچے سے اچھل کر طشتری میں گر جاتی تھی۔ ایک ملاقات کے موقع پر چینی ملانے کے لئے میں نے ضیاء کی مدد کی تھی۔ جب وہ باہر آئے تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں اتنی بڑے آدمی کی خدمت حواس باختہ اور کانپے بغیر کس طرح کر لیتا ہوں؟۔

www.bhutto.org

یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جنرل ضیاء کو ایک دن شہید بابا نے ملاقات کے لئے چھ بجے شام کا وقت دیا۔ لیکن جنرل ضیاء سوا پانچ بجے ہی وہاں پہنچ گئے اور اے ڈی سی خالد حمید کے پاس بیٹھ گئے اور سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ اسی دوران بھٹو صاحب نے مجھے ایک فائل دی اور کہا کہ میں ان کے اے ڈی سی کو دے آؤں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں دوسری فائل لے کر اے ڈی سی کے کو دے آیا جہاں ضیاء بیٹھے ہوئے تھے۔ فوراً ہی اے ڈی سی کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اے ڈی سی نے کہا اندر آ جائیں، دروازہ کھلا تو شہید وہاں صحیح فائل ہاتھ میں لئے کھڑے تھے ان کو دیکھ کر کمرے میں موجود تمام لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ ضیاء اس قدر بدحواس ہوئے کہ انہوں نے اپنا جلتا ہوا سگریٹ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ ضیاء کو دیکھ کر شہید بھٹو نے ان سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ باہر لان میں چلیں۔ اور ضیاء ان کے پیچھے چل پڑے۔ چند لمحوں بعد کپڑا جلنے کی بو آئی اور ضیاء کی جیب سے دھواں نکلنے لگا۔ شہید بابا نے جو دیکھا تو مجھے فوراً تولیہ لانے کو کہا۔ اور میں نے تولیہ ضیاء کی جیب پر رگڑ کر آگ بجھا دی۔ ضیاء کے جانے کے بعد شہید نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہا کہ ایسا بزدل اور بدحواس جنرل میدان جنگ میں دشمن کا کیا مقابلہ کرے گا۔

۴ر اور ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو میں ان کی خدمت میں مصروف تھا۔ عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب، کوثر نیازی صاحب، غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب اور ممتاز علی بھٹو صاحب ان کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے تھے اور سیاسی حالات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے وہ رات تقریباً ڈیڑھ بجے اپنے سونے کے کمرے میں آئے اور مجھ کو کہا کہ اب وہ مزید فائلیں نہیں دیکھیں گے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ ان کی میز پر سزائے موت پانے والے دو مجرموں کی رحم کی اپیلوں کی فائلیں رکھی ہیں۔ جن کو دوسری صبح پھانسی دی جانے والی تھی۔ میں فوراً واپس آیا اور بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر میں نے وہ فائلیں ان کو پیش کر دیں۔ وہ فوراً بیٹھ گئے اور ان دونوں کی سزائے موت میں تخفیف کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اب وقت بہت کم ہے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کے سیکرٹری زاہد حسین سے کہوں کہ وہ فوراً اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار کو جگا کر بتائیں کہ ان مجرموں کی سزا میں تخفیف کر دی گئی اور صبح ان کو پھانسی نہ دی جائے۔ جب صبح پونے دو بجے کے قریب میں اپنے کمرے میں واپس آ رہا تھا تو ایک سیکورٹی افسر مل گیا جس نے مجھے بتایا کہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس سے مارشل لاء کا مطلب پوچھا کیونکہ میں ان چیزوں سے بالکل ناواقف تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ہے اور فوج

www.bhutto.org

نے اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے فوراً میجر جنرل امتیاز سے رابطہ کیا اور ان کو یہ خبر بتائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ معلومات کر کے کچھ کہہ سکیں گے۔ لیکن میں نے ان کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اور نور محمد مغل کو بتانے کے لئے فوراً باہر آیا۔ راستے میں مجھے ایک فوجی افسر نے رکنے اور ہاتھ اوپر اٹھانے کا حکم دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ اوپر کر لئے ساتھ ہی میں نے اس فوجی افسر سے کہا کہ وہ اپنے افسران بالا سے معلوم کر لیں کہ میں آگے بڑھ سکتا ہوں یا نہیں۔ جوں ہی وہ اپنے افسران بالا سے معلوم کرنے گیا میں وہاں سے نور محمد مغل کے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔ اور اس کو مارشل لاء کے نفاذ کی اطلاع دی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ باہر نہ نکلوں اور خاموش رہوں۔ لیکن میں بھاگ کر بھٹو صاحب کے بیڈ روم تک پہنچ گیا اور ان کو مارشل لاء کے بارے میں بتایا انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کے بچوں کو بھی بیڈ روم میں لے آؤں جس کی میں نے فوراً تعمیل کی۔ ایک فوجی افسر نے جو وہاں ڈیوٹی پر موجود تھا مجھے بتایا کہ کئی ٹینکوں نے وزیراعظم کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا ہے اور وہ ایک منٹ کے اندر اسے تباہ کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس افسر نے یہ بھی کہا کہ میں بھٹو صاحب کو بتا دوں کہ جس طرح مناسب ہو اپنے آپ کو بچائیں۔ میں شہید بابا کے پاس گیا اور سب کچھ بیان کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا "زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے میں خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا"

اس وقت صبح کے دو بجے تھے اور وزیراعظم ہاؤس مکمل طور پر محصور کر لیا گیا تھا۔ شہید بھٹو نے ضیاء سے ٹیلی فون پر مارشل لاء کے بارے میں معلوم کیا لیکن وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ وہ شاید اس کے نتائج سے خوفزدہ تھا۔ تین بجے کے قریب فوج نے وزیراعظم ہاؤس کے تمام ٹیلی فون منقطع کر دیئے۔ بیگم صاحبہ، بے نظیر صاحبہ، صنم بھٹو صاحبہ، میر مرتضیٰ بھٹو اور شہید شاہ نواز بھٹو کو وزیراعظم ہاؤس سے علی الصبح چلے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ جنرل ضیاء نے شہید کو یقین دلایا کہ وہ اسی طرح وزیراعظم رہیں گے اور ان کو تمام آداب اور اعزاز حاصل رہیں گے اور صرف تین ماہ بعد انتخابات کرا دیئے جائیں گے۔ لیکن وقتی طور پر ان کو (شہید بابا) سہالہ ریسٹ ہاؤس منتقل ہونا ہو گا۔ شہید بابا نے مجھے حکم دیا کہ میں سامان اکٹھا کر کے کراچی لے جاؤں اور تمام متعلقہ لوگوں کو بتا دوں کہ شہید کے مشورے اور اجازت کے بغیر طاقت کے ذریعہ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔

جب بھٹو صاحب مری سے رہا ہو کر کراچی واپس آئے تو انہوں نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ فوج ان کو جیل میں رکھے یا نہ رکھے لیکن ان کو جان سے مارے دینے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ جب فوج شہید بھٹو کو نواب محمد احمد خان کے جھوٹے مقدمہ قتل کے

www.bhutto.org

الزام میں گرفتار کرنے آئی۔ میں بھٹو صاحب کو سحری کھلا کر بیڈ روم سے واپس آ رہا تھا کہ ایک فوجی نے مجھے گردن سے پکڑا اور دیوار کی طرف دھکیل دیا اور یہ ہی کارروائی دوسرے ملازمین کے ساتھ کی گئی۔ شاید وہ خوفزدہ تھے کہ ہم بھٹو صاحب کی کسی خفیہ طریقے سے مدد کر دیں گے۔ اس لئے سب سے پہلے انہوں نے ہم سب کو قابو کیا۔ اس کے بعد وہ بھٹو صاحب کے کمرے میں گئے تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ اپنے بچوں کے ساتھ واپس آ رہی ہیں۔ بھٹو صاحب نے باہر آنے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ میں ان کا سامان تیار کروں۔ فوجی افسر شہید بابا کے کمرے سے باہر آیا اور کئی مرتبہ میرا نام لے کر آواز دی لیکن میں خاموش رہا۔ اور جب میں نے ان کو آپس میں مجھے گولی مار دینے کی باتیں کرتے سنا تو میں ڈر کے مارے سامنے آ گیا۔ انہوں نے مجھے پکڑا۔ اور کمرے میں لے جا کر پھینک دیا۔ میں نے شہید بابا کی چیزوں کو ان سب کے سامنے باندھنا شروع کر دیا۔ دوسری صبح انہوں نے بیگم صاحبہ، بے نظیر صاحبہ، شاہ نواز بھٹو اور مجھے چھوڑ دیا۔ لیکن باقی ملازمین کو گیراج میں بند کر دیا۔ مکان کا کونہ کونہ فوج کے قبضے میں تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ امن پسند شہری کی گرفتاری کے لئے کسی دوسری فوج سے لڑنے آئے ہوں۔ شہید بابا کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور وہ لاڑکانہ آ گئے۔ اور پھر عید کے موقع پر شہید بابا میر مرتضٰی اور شاہ نواز شہید نوڈیرو کی عید گاہ میں نماز عید ادا کرنے گئے۔ ہزاروں لوگ ان کی آخری عید پر ان کو مبارک باد دینے آئے۔ اور میں آدھی رات کو اپنے گھر واپس آ سکا۔

ہمارے محبوب سیّد الشہداء حضرت امام حسینؑ کی روایات کے مطابق شہید بابا نے ہم سب کو "المرتضٰی" طلب کیا اور کہا کہ مستقبل ان کے لئے بہت مشکلات لے کر آئے گا اور ان کو بڑی قربانیاں دینا ہوں گے۔ لہٰذا اگر ہم میں سے کوئی ان کا ساتھ چھوڑنا چاہتا ہے تو وہ ایسا کرنے کے لئے آزاد ہے اور وہ ایسے شخص کو سبکدوش کرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ ہم نے شہدائے کربلا کی مثال سے حوصلہ حاصل کرتے ہوئے ان کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ہم میں سے ہر ایک نے یہی کہا کہ وہ شہید بابا کے ساتھ ہو گا چاہے کچھ بھی ہو۔

آخر کار میں نے شہید بابا کو پاکستان کی عدالت عظمٰی میں دیکھا اور ان کی حالت دیکھ کر لرز گیا۔ وہ جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن ان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بشاش تھا۔

میں شہید بابا کے ساتھ ساری دنیا دیکھی۔ ان کو کئی سربراہان مملکت کے ساتھ دیکھا لیکن شہید بابا ان سب میں پروقار اور قد آور شخصیت تھے۔

اب جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو ہم اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں لیکن ہم نے ایسا کبھی نہیں سوچا کہ وہ ہم کو چھوڑ کر اور سچائی اور انصاف کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے

www.bhutto.org

تاریخ میں ایک ایسا نشان بن جائیں گے جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید چمکدار ہوتا جائے گا۔

www.bhutto.org

گھر پیارا گھر

عثمان فلیش مین

شہید جب بھی "المرتضیٰ" میں داخل ہوتے تھے تو سب سے پہلے باغ کے ایک کونے میں جا کر اپنے پالتو ہرن کو دیکھتے تھے۔ وہ اس ہرن سے بہت محبت کرتے تھے۔ دوسرا نمبر طوطے کا تھا جو شہید سے بہت مانوس تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شہید ذرا ستانے کے لئے آرام کرسی پر ہوتے یا لکھنے کی میز پر کام کر رہے ہوتے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے رک کر کچھ سوچنے لگتے تھے تو وہ طوطا ان کے پاس پہنچ جاتا اور ان کا قلم اٹھا کر اس سے ان کا سر کھجانا شروع کر دیتا تھا۔

ان کو درختوں سے بھی بڑی محبت تھی۔ "المرتضیٰ" کے سبزہ زار میں مسز بندرانائیکے نے پیپل کا ایک پودا لگایا تھا جو بڑھ کر اب ایک تناور درخت بن گیا ہے۔ بھٹو شہید خصوصیت سے اس درخت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اکثر ملازمین کو ہدایت کرتے رہتے تھے کہ وہ اس درخت کی خاص طور پر دیکھ بھال کیا کریں کیونکہ وہ مسز بندرانائیکے کا لگایا ہوا تھا ہم سب کو اس کی حفاظت کرنی چاہئے اور کبھی اس کو کاٹنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہئے۔ درختوں کے ساتھ ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ انہوں نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ بہت پرانا سوکھا ہوا درخت بھی نہ کاٹا جائے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ان کو مجبوراً ایک درخت کاٹنے کا مشکل فیصلہ کرنا پڑا تھا۔

www.bhutto.org

ان کے تیراکی کے تالاب کے بالکل ساتھ ہی کھجور کا ایک درخت تھا۔ اور اس کی شاخیں عین تالاب کے اوپر جھکنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس طرح نہ صرف درخت کے پتے اور کھجوریں تالاب میں گرتی تھیں بلکہ اس درخت پر بنائے ہوئے پرندوں کے گھونسلوں سے گری ہوئی تمام گندگی تالاب کے پانی کو گندہ اور بدبو دار کر دیتی تھی۔ شہید نے اپنی "المرتضٰی" آمد پر مالی سے کھجور کے درخت کے بارے میں دریافت کیا۔ مالی اچھی طرح جانتا تھا کہ شہید کو درخت کاٹنے سے سخت نفرت ہے لہٰذا اس نے جواب دیا کہ وہ اس کے لئے کوئی حل نکالے گا۔ دوسری بار جب شہید پھر "المرتضٰی" آئے تو مالی سے پھر وہی سوال کیا۔ مالی نے تالاب پر شامیانے لگانے کی تجویز پیش کی تاکہ گندگی پانی میں نہ گرے۔ جب شہید تیسری مرتبہ آئے تو وہ مسئلہ اسی طرح موجود تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے عرض کیا "جناب درخت تو ٹھیک ٹھاک جا رہا ہے لیکن اس کی وجہ سے تیراکی کا تالاب برباد ہو گیا ہے۔ اور سارا پانی گندہ ہو گیا ہے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ درخت کو کاٹ دیا جائے۔ شہید کافی دیر سوچتے رہے اور پھر کہا "میں اسی وجہ سے پریشان تھا..... ٹھیک ہے..... اگر کچھ نہیں ہو سکتا تو ہم کو اسے کاٹنا ہی ہو گا" لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اس فیصلے کے بعد افسردہ ہو گئے تھے۔

ان کی حکومت کے دوران کئی محکمے اور کارخانے وغیرہ ان کو تحفے کے طور پر شیلڈیں (تغرے اور دیگر آرائشی اشیاء) دیا کرتے تھے اور وہ سب اپنے ڈبوں ہی میں بند پڑی تھیں۔ میں نے ان سب چیزوں کو مہمان خانے اور کھانے کے ہال میں چاروں طرف دیواروں پر لٹکا دیا۔ جو ابھی تک وہاں آویزاں ہیں۔ جب محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے دور حکومت میں پہلی مرتبہ "المرتضٰی" آئیں تو شہید ان کو مہمان خانہ دکھانے لائے۔ اس وقت میں وہاں دیوار پر شہید کی ایک بڑی تصویر آویزاں کر رہا تھا۔ شہید نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ اپنی یہ تصویر انہوں نے فرانس میں اتروائی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے شیلڈوں کے بارے میں پوچھا تو میں نے ان کو بتایا کہ وہ سب ڈبوں میں بند پڑی تھیں لہٰذا میں نے ان کو یہاں لگا دیا۔ انہوں نے اس پر اپنی خوشی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور ایک ایک کر کے ان کو دیکھنا شروع کیا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کو انکے متعلق بتاتے رہے۔ شہید نے محترمہ بے نظیر بھٹو سے میرا تعارف کرایا یہ ہمارا بہترین بڑھئی ہے۔ "یہ بہت اچھا آرائش کار (سیٹ ڈیزائنرز) بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی تھوڑا سا احمق بھی ہے" محترمہ بے نظیر بھٹو نے احترام کے ساتھ مجھے السلامُ علیکم کہا۔

کبھی کبھی وہ فلم پروجیکٹر کے ذریعہ فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ میں راولپنڈی میں فلم چلتے وقت پروجیکٹر کے بالکل ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دن وہ ایک فلم "نیا سورج" دیکھ رہے تھے جو بنگلہ دیش

www.bhutto.org

میں بنی تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان کے ساتھ تھیں۔ وہ فلم قحط کے دوران غریبوں کی تباہ حالی پر بنائی گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن پردہ سینما سے منعکس ہونے والی روشنی شہید کے چہرے پر پڑھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جھلک رہے تھے۔ اس فلم سے وہ اس قدر دلبرداشتہ ہوئے کہ انہوں نے اندھیرے کمرے میں ہی میں رونا شروع کر دیا۔

ایک اور موقعہ پر میں ان کی خاندانی تلواروں کو "المرتضیٰ" کے ایک کمرے میں آراستہ کر رہا تھا کہ ایک تلوار ہاتھ سے پھسل کر میرے پاؤں پر گری اور میرا پاؤں کٹ گیا۔ مجھے زخمی دیکھ کر شہید پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر مجھے دیا اور کہا "فوراً ڈاکٹر کے پاس جاؤ ہو سکتا ہے کہ وہ تلوار زہر آلود ہو۔" میں کمرے سے باہر نکلا اور ڈاکٹر نصیر شیخ نے میری مرہم پٹی کی۔ اور ٹیکہ لگایا۔ نشانی کے طور پر اس زخم کا نشان آج بھی میرے پاؤں پر موجود ہے۔ شہید کا دیا ہوا وہ رومال بھی میرے پاس اب بھی موجود ہے اور میرا فاخرانہ اور قیمتی سرمایہ ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا شہید اپنے ہرنوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دن وہ ہرنوں کے احاطے کے اندر چلے گئے ایک ہرن نے سینگ سے ان پر حملہ کر دیا اور ان کا کوٹ پھاڑ دیا۔ ہرنوں کا نگران اس صورت حال سے پریشان ہو گیا۔ اور مجھے یہ واقعہ سنایا۔ میں نے اس مسئلہ کا حل یہ سوچا کہ لکڑی کی گیندیں ہرنوں کے سینگوں پر جڑ دیں۔ جب شہید دوبارہ وہاں گئے تو حیران رہ گئے کہ وہ نوکدار سینگ راتوں رات گول کس طرح ہو گئے۔ ہرنوں کے نگران نے ان کو بتایا کہ اس دن کے واقعہ کے بعد ان کے سینگوں کے لئے وہ ہیلمٹ تیار کئے گئے تھے۔ شہید نے اس بات پر ایک بہت زور دار قہقہہ لگایا اور اندر جا کر اپنے ملٹری سیکرٹری کو فون پر کہا کہ "اس بیوقوف آدمی نے مجھے بہت ہنسایا ہے۔"

ملٹری سیکرٹری نے مجھے بلایا اور یہ پوچھ کر مجھے تعجب میں ڈال دیا کہ میں نے وزیر اعظم کو اتنا کیوں ہنسایا۔ میں نے ملٹری سیکرٹری کو بتایا کہ میں نے تو اس دن وزیر اعظم کو دیکھا تک نہیں تھا۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہوئی ہے۔ اس کے بعد جب میرا وزیر اعظم سے سامنا ہوا تو میں شرمسار تھا لیکن وزیر اعظم اپنا قہقہہ نہیں روک سکے۔

شاہ ایران کے اعزاز میں ایک ثقافتی تقریب "المرتضیٰ" میں منعقد کی گئی تھی۔ شہزادہ کریم آغا خان بھی معزز مہمان کے طور پر اس موقع پر مدعو تھے۔ کراچی کے ایک باورچی "لڈن خان" نے اس موقع پر شامی کباب تیار کئے تھے اور وہ خود ہی مہمانوں کو پیش کر رہا تھا۔ شہید نے

www.bhutto.org

ایک کباب چکھا اور کہا "واہ لڈن خاں! کیا بہترین کباب بنائے ہیں" یہ سن کر لڈن خان خوشی سے پاگل ہو گیا اور بوکھلایا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس باورچی خانے میں آیا۔ اور یہ بتاتے ہوئے کہ شہید نے کس طرح اس کے کبابوں کی تعریف کی ہے۔ خوشی کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا اور وہیں انتقال کر گیا۔ شہید کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو بہت غمزدہ ہو گئے اور بار بار افسوس کرتے رہے "یہ کیسے ہو سکتا ہے ابھی تو لڈن خاں یہاں کھڑا تھا" تھوڑی دیر کے لئے تقریب روک دی گئی اور شہید نے عبدالوحید خاں کپٹر، صوبائی وزیر صحت کو حکم دیا کہ لڈن خاں کی میت دوسرے لوگوں کے ساتھ ایمبولینس کے ذریعہ فوراً اس کے گھر لیاقت آباد کراچی بھیج دی جائے۔

ایک مرتبہ شہید نے مجھے حکم دیا کہ ان کے سونے کے کمرے میں مغل پینٹنگز لگائی جائیں۔ میں نے ان تصاویر کو اس طرح ترتیب دیا کہ وہ ایک دوسرے کے روبرو نہیں تھیں۔ شہید عجلت میں تھے لیکن پھر بھی رک گئے اور کہا "کیا مغل وزیر بادشاہ سے ناراض ہیں" "جناب! میں اس زمانے کی سیاست کو نہیں جانتا" میں نے جواب دیا۔

انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان تصاویر کی ترتیب بدل دوں۔ اور اب وہ تصاویر ایک دوسرے کے روبرو تھیں۔ بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

اس کے بعد شہید ائیرپورٹ روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ سے مجھے یہ سبق حاصل ہوا کہ شہید معمولی باتوں کا بھی غور سے جائزہ لیتے تھے اور ان کے ساتھ آئندہ محتاط رہنا ہو گا۔

میں بہاول، رسول بخش اور صالح محمد کے ساتھ "المرتضیٰ" کے برآمدے میں کھڑا تھا کہ شہید چیئرمین جناب یاسر عرفات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھانے کے کمرے سے نمودار ہوئے۔ شہید رک گئے اور جناب یاسر عرفات سے ہمارا تعارف کرایا جنہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا اور اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ ہم سب کو بیس بیس ڈالر دے دیں۔

راولپنڈی میں کسی نے شہید کو کتے کے دو بچے تحفے میں دیئے۔ جو بعد میں میرے لئے ایک مسئلہ بن گئے۔ میں ان کو پنڈی سے لاڑکانہ لایا۔ کچھ مہینوں کے بعد جب شہید "المرتضیٰ" آئے تو ان میں ایک کافی بڑا ہو گیا تھا جب کہ دوسرا بالکل چھوٹا رہ گیا ان کو یقین نہیں آیا کہ یہ وہی پلے ہیں جو ان کو تحفے میں دیئے گئے تھے۔ چنانچہ اس شخص سے رابطہ کیا گیا جس نے وہ دیئے تھے۔ اس شخص نے تصدیق کی کہ ان میں سے ایک چھوٹی اور دوسرا بڑی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ چھوٹے کتے کا نام "ہیپی" تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی کتاب "دختر مشرق" میں لکھا ہے کہ انہوں نے کسی طرح اس چھوٹے کتے کو اپنے اوور کوٹ میں چھپا لیا تھا اور اس کو جیل کے صحن میں چھوڑ دیا تھا "ہیپی" نے چاروں طرف دیکھا اور بھاگ کر سیدھا شہید کی کوٹھڑی تک پہنچ گیا۔

www.bhutto.org

کتوں کی بات کرتے ہوئے مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ "المرتضیٰ" میں ایک کھلی کچہری کے دوران ایک شخص ملنے والوں کی قطار میں اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پیٹھ شہید کی طرف تھی۔ جب شہید کے پاس پہنچا۔ اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ شہید نے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے"

"آپ کے گیٹ پر کتوں نے میرے ساتھ یہ کیا ہے۔" اس آدمی نے جواب دیا "لیکن گیٹ پر تو کتے نہیں ہیں" شہید نے کہا۔

"جناب عالی میری قمیص پولیس کی وردی میں ملبوس کتوں نے پھاڑی ہے جو آپ کے گیٹ پر تعینات ہیں"

سپرنٹنڈنٹ پولیس جو ڈیوٹی پر تھا غصے میں آ گیا لیکن شہید نے اسے خاموش کر دیا اور اس آدمی سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتا ہے "میں آپ کے ہیلی کوپٹر میں بیٹھنا چاہتا ہوں" اس آدمی نے خواہش ظاہر کی۔ وہاں غدار جام صادق اور جتوئی بھی موجود تھے شہید ان کی طرف مڑے اور کہا "آپ نے سنا یہ آدمی کیا چاہتا ہے" اس کے بعد انہوں نے مجھے حکم دیا کہ شام سے پہلے اس آدمی کے لئے دو جوڑے کپڑے تیار ہو جائیں "اس کو باورچی خانے میں لے جاؤ اور خوب کھانا کھلاؤ۔ شام کو یہ شخص ہیلی کوپٹر میں میرے ساتھ ہو گا۔"

میں اور نور محمد مغل اس کو فوراً ایک قریبی درزی کے پاس کپڑے سلوانے کے لئے لے گئے۔ اور پھر کھانے کے لئے واپس لے آئے۔ ہیلی کوپٹر کی سواری کے بدلے میں اس کو ایک ہزار روپے دے دیئے گئے کیونکہ حفاظتی عملے کا خیال تھا کہ اس آدمی کا ذہنی توازن درست نہیں ہے اور وہ پرواز کے دوران ہیلی کوپٹر سے کودنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ میں برآمدے میں بیٹھا تصویروں کے کچھ ٹوٹے ہوئے فریم مرمت کر رہا تھا۔ شہید بھٹو اپنے کمرے سے باہر آئے اور مجھ سے دریافت کیا "کیا اذان ہو گئی" میں سمجھا کہ وہ پوچھ رہے ہیں کہ "فریم مرمت ہو گئے ہیں" اور جواب دیا "جی جناب" شہید نے پلیٹ سے کھجوریں اٹھائیں اور کھالیں۔ تھوڑی دیر بعد تاج محمد خدمت گار کھانے کی ٹرالی کے ساتھ نمودار ہوا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ شہید بھی اس کے پیچھے چلے گئے اور کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اذاں ہوئی اور مجھے احساس ہوا کہ میری غلطی کی وجہ سے انہوں نے روزہ دس منٹ قبل افطار کر لیا۔ میں بری طرح گھبرا گیا۔ اور فریم برآمدے میں ہی چھوڑ کر اپنے گھر بھاگ گیا۔ ان کی اگلی دو مرتبہ "المرتضیٰ" آمد پر میں ان کے سامنے آنے سے کتراتا رہا۔ تیسری مرتبہ ان کی آمد پر جو کھلی کچہری کے سلسلے میں تھی، میں ان کو سلام کرنے گیا۔ شہید

www.bhutto.org

مجھے دیکھ کر صرف مسکرا دیئے اور میں سمجھ گیا کہ میری غلطی معاف کر دی گئی ہے۔

ایک دن شہید جب "المرتضیٰ" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ صدر دروازے پر کافی لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ کراچی سے ایک بوڑھا اپنی بیٹی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ میں جا کر بوڑھے سے ملا تو اس نے بتایا کہ غربت کی وجہ سے وہ اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر پا رہا ہے۔ اور وزیراعظم سے کچھ مدد چاہتا ہے۔ میں اندر گیا اور نور محمد مغل سے کہا کہ اگر وہ یہ بات شہید کے علم میں لے آئیں تو شاید اس بوڑھے کو کچھ امداد مل جائے۔ نور محمد نے شہید کو جا کر بتایا۔ انہوں نے ہم دونوں کو باہر بھیجا کہ اس بات کی تصدیق کریں کہ بوڑھے کی بات واقعی سچ ہے۔ ہم نے بوڑھے آدمی سے تفصیل سے سب کچھ معلوم کیا اور یقین کر لینے کے بعد شہید کو بتایا کہ بوڑھا واقعی ضرورت مند ہے۔ شہید نے اپنے بریف کیس سے بیس ہزار روپے نکالے اور ہمیں ہدایت کی کہ وہ رقم بوڑھے کے حوالے کر دیں۔ جب ہم نے وہ رقم بوڑھے کو دی تو اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اس نے ہم دونوں کو ایک ایک ہزار روپے بطور انعام دینے کی کوشش کی لیکن ہم نے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ جائے اور اپنی بیٹی کی شادی کرے۔

یہ کہانی کہ میں "فولش مین" سے "فلیش مین" کیسے بنا بڑی دلچسپ ہے۔

شہید نوادرات کا منفرد ذوق رکھتے تھے۔ وہ ۱۷ کلفٹن پر ایک نوادر گیٹ لگوانا چاہتے تھے کٹپر صاحب نے ایک دروازہ جیکب آباد سے بیس ہزار روپے میں حاصل کیا جو معمولی سا تھا۔ میں نے شہید سے عرض کیا کہ میں ایک ایسا دروازہ لا سکتا ہوں جس پر جانوروں کی شبیہہ کندہ کی گئی ہیں اور وہ بھی مفت! اس بات پر شہید مسکرائے اور صرف اتنا کہا "فولش (Foolish)" اس کے بعد وہ اسلام آباد چلے گئے اور میں لاڑکانہ لیکن وہ میری پیش کش کو بھولے نہیں تھے۔ کیونکہ صرف چار دن بعد کراچی کی "وکٹوریہ فرنیچر کمپنی" کے مسٹر ہیلفرام میرے پاس لاڑکانہ آئے اور کہا کہ میں ان کو وہ دروازہ دکھاؤں۔ میں ان کو لاڑکانہ سے بیس کلو میٹر دور ایک گاؤں میں لے گیا اور ان کو وہ دروازہ دکھایا۔ مسٹر ہیلفرام کو بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے بتایا کہ اس دروازے کی قیمت تقریباً دو لاکھ روپے ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا "آپ فکر نہ کریں۔ دروازہ میرا ہے اور میں بھٹو صاحب کا"

جس وقت وہ دروازہ ۷۰ کلفٹن پر لگایا جا رہا تھا شہید کراچی میں تھے اور بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا "اس کو ایک سرٹیفکیٹ دے دیں" سرٹیفکیٹ انگریزی زبان میں تھا اس لئے میں نے سیکرٹری سے پوچھا کہ اس میں کیا لکھا ہے" اس میں لکھا ہے کہ آج سے تم "فولش مین" نہیں بلکہ "فلیش مین" ہو۔ انہوں نے مذاقاً جواب دیا۔

www.bhutto.org

میرے لاڑکانہ کے چھوٹے سے مکان میں وہ سرٹیفکیٹ جس نے مجھے "فولش مین" سے "فلیش مین" بنا دیا تھا آج بھی دیوار پر ایک نمایاں جگہ پر سجا ہوا ہے اور ہر آنے والا اسے دیکھ سکتا ہے۔

www.bhutto.org

میرا صاحب

عبدالقیوم خان

میرا نام عبدالقیوم ہے اور میرا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں "پریانہ" سے ہے۔ میں محکمہ زراعت میں بطور فیلڈ اسسٹنٹ ملازم تھا۔ میں نے ۱۹۶۸ء میں ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی ملازمت کے دوران حیات محمد خاں شیر پاؤ سے میرے دوستانہ تعلقات ہو گئے اور میں نے ان کو ایک رحمدل زمیندار پایا وہ پابندی سے زرعی اداروں کی طرف سے منعقدہ نمائشیں دیکھنے آتے تھے اور پیداوار کی مختلف اقسام اور دیگر نمائشی اشیاء میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی کابینہ سے الگ ہو گئے تو انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور حیات محمد خاں شیر پاؤ نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ میں چونکہ جناب بھٹو کی اقوام متحدہ میں کی گئی تقریر سے بہت متاثر تھا اس لئے میں بھی فوراً اس پارٹی کا رکن بن گیا۔ جب بھی قائد عوام پشاور آتے تو میں کبھی بھی اپنی محبوب شخصیت سے بات چیت کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔

جون ۱۹۶۹ء میں فارم منیجر جو بھٹو صاحب کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا وفات پا گیا تو انہوں نے حیات محمد خاں شیر پاؤ سے کہا کہ وہ قیوم (مجھے) کو لاڑکانہ بھیج دیں۔ اپنے گھریلو حالات کے پیش نظر میں تقریباً دو ماہ تک اس پیش کش کو ٹالتا رہا۔ آخر کار بھٹو صاحب

www.bhutto.org

نے ایک مرتبہ اپنی پشاور آمد کے موقع پر مجھ سے دو ٹوک الفاظ میں دریافت کیا کہ میں لاڑکانہ آنا چاہتا ہوں یا نہیں۔ میں ان سے انکار نہ کر سکا اور اپنے گھروں والوں کو بتائے بغیر ہی پہلی گاڑی سے لاڑکانہ روانہ ہو گیا۔ جہاں مجھے زمینوں کا انتظام سونپا گیا۔ نومبر ۱۹۶۹ء میں بھٹو صاحب اپنے زرعی فارم پر آئے اور میری کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ انتخابات میں مصروف ہو گئے اور پھر برسراقتدار آ گئے۔ لیکن میں بھی اپنے فرائض محنت اور جان فشانی سے ادا کرتا رہا۔ صوبہ سرحد میں ایک فیلڈ اسسٹنٹ ہونے کی حیثیت سے میرا سابقہ صوبہ سرحد کے بڑے بڑے زمینداروں سے پڑتا تھا اور اور مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ ان میں صرف چند ایک کے علاوہ سب ہی نہایت ظالم اور مطلق العنان تھے۔ صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت سے قبل زمین پر ہل چلانے والا غریب مزارعہ کُلیتاً زمیندار کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔ لیکن جب بھٹو صاحب آئے تو انہوں نے ہاریوں کے حقوق کی بحالی کے احکامات جاری کئے مارچ ۱۹۷۲ء میں بھٹو صاحب نے ملک میں زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ ایوب خان کی سابقہ اصلاحات کے برعکس اس مرتبہ لاکھوں ایکڑ زمین بڑے بڑے جاگیرداروں سے لے کر بے زمین اور غریب کسانوں میں مفت تقسیم کی گئی۔ میرے علاقے "دنہور" میں ان اصلاحات کے تحت کئی بے زمین کاشت کاروں کو مفت زمین حاصل ہو گئی جس کی وجہ سے اس علاقے میں خوشحالی آ گئی۔ جب ایوب خان نے یہ اصلاحات نافذ کی تھیں تو بھٹو خاندان کی جیکب آباد کی بہت ساری زمین لے لی گئی تھی۔ بعد میں جب یہ اصلاحات خود انہوں نے نافذ کیں تو انہوں نے بتایا کہ اس سے وہ چالیس ہزار ایکڑ زمین سے محروم ہوں گے۔ اور ان کے بچوں کو بھی یہ نقصان برداشت کرنا ہو گا لیکن وہ شائد پیدا ہی اس لئے ہوئے تھے کہ غریبوں کی حالت سنواریں انہوں نے یہ اصلاحات ملک کے بہترین مفاد میں نافذ کر دیں۔ بھٹو صاحب کی کافی زمین ان اصلاحات کے تحت ہاریوں میں تقسیم کر دی گئی، اور بھٹو صاحب نے مجھے منع کر دیا کہ میں آئندہ فصل سے اپنا حصہ وصول نہ کروں۔ لیکن ان ہاریوں کے ذمہ تقاوی کا تقریباً ایک لاکھ روپیہ واجب الادا تھا جس کے لئے میں نے کامدار اللہ بخش کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان سے بروقت وصول کرے۔ لیکن اس شخص اللہ بخش نے میری اجازت کے بغیر مختار کار کو درخواست دے دی کہ ہاری تقاوی کی رقم کی ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں چنانچہ مختار کار نے پولیس کو ان ہاریوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ جب بھٹو صاحب لاڑکانہ آئے تو ان متاثرہ ہاریوں کے رشتہ داروں نے ان کو درخواست پیش کی کہ کامدار اللہ بخش ان سے فصل کا حصہ مانگ رہا تھا اور جب ہاریوں نے انکار کیا تو ان کو گرفتار کرا دیا۔ اگرچہ ہاریوں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا پھر بھی کامدار کو گرفتار کر لیا گیا۔ میں اس کی

www.bhutto.org

رہائی کے لئے ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا تو انہوں نے بتایا کہ کامدار کو بھٹو صاحب کے حکم پر گرفتار کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ہاریوں سے اس زمین کی فصل طلب کر رہا تھا جو زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں ان کو دے دی گئی تھیں۔ میں نے ڈپٹی کمشنر کو دستاویزی ثبوت پیش کئے۔ ہم صرف نقاوی کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس طرح ہمارے کامدار کی ضمانت پر رہائی ہو گئی۔ جب میں لاڑکانہ پہنچ کر بھٹو صاحب سے ملا اور ان پر صورت حال واضح کی تو انہوں نے کہا "قیوم! کیا تم ان غریب ہاریوں کو گرفتار کروا کر قرضہ وصول کرنا چاہتے ہو" میں نے جواب دیا کہ وہ ادائیگی سے انکار کر رہے تھے۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہا "قیوم جب ہم نے ان کو لاکھوں روپے مالیت کی زمین دے دی تو اس قرضے کی کیا حقیقت ہے جو تم ان سے وصول کرنا چاہتے ہو۔ جاؤ وہ قرضے خارج کر دو"

"دوسرے جاگیرداروں کے برعکس انہوں نے بذات خود اس بات کی نگرانی کی کہ ان کی زمینیں بغیر کسی رکاوٹ کے ہاریوں میں تقسیم کی جائیں۔

قصبہ "ڈوسوڈارو" جانے والی ایک سڑک ہمارے فارم کے قریب سے گزرتی تھی۔ اس وقت ممتاز علی بھٹو سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اور ان کی ناقابل کاشت زمین پر جنگل پیدا ہو گئے تھے اس کے باوجود اس جنگل کے درمیان سے ایک پکی سڑک گزرتی تھی کیونکہ یہ جنگل ممتاز علی بھٹو کی شکار گاہ تھی۔ ہمارا گاؤں "عزت جیون" اس سڑک سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں میں تقریباً ۲۵۰ افراد رہتے تھے جن میں سے زیادہ تر ان زمینوں پر کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کو گرمی اور بارش کے موسم میں سخت تکلیف اٹھانا پڑتی تھی۔ ایک بار میں نے بھٹو صاحب سے عرض کی کہ اگر دو میل کی ایک سڑک کے ذریعہ جنگل والی پہاڑی سڑک سے ملا دی جائے تو گاؤں کے باشندوں کو بڑی آسانی ہو جائے گی۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا "نہیں! نہیں! سرکاری طور پر بنائی جانے والی سڑک ہماری ذاتی زمین سے نہیں گزر سکتی" میں نے عرض کیا "جناب میں اپنی زمین پر سڑک بنانے کی بات نہیں کر رہا ہوں میں تو ایک ایسے گاؤں کے لئے کہہ رہا ہوں جو اس کا مستحق ہے جس طرح پاکستان کے دوسرے علاقے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جنگلوں کے درمیان سرکاری طور پر سڑکیں بنائی جا رہی ہیں کیا ہمارا دو میل کا ٹکڑا نہیں بن سکتا۔"

"جو لوگ غلط کام کر رہے ہیں وہ اس کے جوب دہ ہوں گے" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

جب میں نے دیکھا کہ میری وکالت بیکار ثابت ہو رہی ہے تو میں نے وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن جوں ہی میں چلنے لگا۔ بھٹو صاحب نے مجھے واپس بلایا اور کہا "قیوم! تم میرے فیصلے پر ناخوش ہو"

www.bhutto.org

میں نے ان کی آنکھوں کی طرف دیکھا جو محبت اور شفقت سے لبریز تھیں۔ آج بھی جب وہ منظر یاد آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ "نہیں صاحب! میں ناخوش نہیں ہوں۔ میرے پاس جیپ موجود ہے اور جہاں چاہوں آ جا سکتا ہوں۔ میں تو ان غریب لوگوں کی خاطر کہہ رہا تھا جو سخت مصائب کا سامنا کرتے ہیں" میں نے اپنا احتجاج جاری رکھتے ہوئے عرض کیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم یہ سڑک خود کیوں نہیں بنا لیتے! لیکن اپنے خرچ پر۔ دیکھو قیوم ہم کو سرکاری رقم اپنے ذاتی کام پر خرچ نہیں کرنی چاہئے۔ ہم سرزمین پاکستان اور یہاں بسنے والوں کے سامنے جوابدہ ہیں" انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنی ذاتی مد سے دو لاکھ روپے سڑک کی تعمیر کے لئے منظور کر دیئے۔ وہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد بھٹو صاحب سازشوں میں گھر گئے اور آخر کار کال کوٹھڑی میں بند کر دیئے گئے۔ حالات روز بروز بگڑتے گئے۔ عدالت عظمیٰ نے ان کی سزائے موت بحال رکھی۔ جیل میں انہوں نے اپنی پہلی بیوی امیر بیگم سے ملاقات کی جو ان کی آخری ملاقات تھی۔ میں بھی امیر بیگم صاحبہ کے ساتھ راولپنڈی گیا تھا لیکن مجھے بھٹو صاحب سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بعد میں امیر بیگم صاحبہ نے بتایا کہ صاحب بالکل پر سکون تھے اور پوچھ رہے تھے کہ میڈیجی سے سکھر تک براستہ نوڈیرو بنائی جانے والی سڑک مکمل ہو گئی یا نہیں یہ تھی میرے صاحب کی دلیری اور حوصلہ کہ وہ موت سے بالکل قریب ہونے پر بھی اپنے علاقے کے لوگوں کی خوشحالی کے کس قدر متمنی تھے۔

راولپنڈی سے واپسی کے لئے امیر بیگم صاحبہ کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہ مل سکا اور وہ ہمارے ساتھ ریل گاڑی سے واپس آئیں۔ ابھی ہم سفر ہی میں تھے کہ فوج نے لاڑکانہ میں "المرتضیٰ" کراچی میں ۷۰ کلفٹن اور نوڈیرو میں امیر بیگم صاحبہ کے بنگلے پر چھاپہ مارا اور ان کے مکان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا اور بیگم صاحبہ کے کپڑے تک سڑک پر پھینک دیئے۔

میں نہیں جانتا کہ ضیاء کو یہ ظالمانہ کارروائی کرنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔ جب میرے صاحب کی بیٹی وزیر اعظم بنیں تو انہوں نے کسی کو نہیں چھیڑا۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء کے خاندان کو بھی۔ جس ظالم انسان نے ہماری زندگی افسوس ناک بنا دی تھی۔

۳ر اپریل کو ہم لاڑکانہ پہنچے اور متذکرہ بالا قصہ سن کر سخت صدمہ ہوا۔

دوسری صبح فجر کی نماز کے بعد میں نے بی بی سی کی خبروں میں سنا کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کے سلسلے میں ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور ان کی فائل جنرل ضیاء کی میز پر ہے۔ اس خبر سے ہمارے اندر ایک مبہم سی امید پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ گھر جا کر ایک پیالی چائے پی لوں۔ لیکن

www.bhutto.org

جب میں واپس آنے لگا تو میں نے دیکھا کہ فوج اور پولیس نے تمام راستے روک رکھے ہیں۔ بڑی مشکل سے میں المرتضیٰ پہنچا اور جب میں نے وہاں لوگوں کو بین کرتے دیکھا تو صدمہ کا ایک شدید جھٹکا سا لگا۔ میں حاجی نذر محمد کے بیٹے افضل قدیر کے ساتھ مختار کار سے ملا جن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے میں نے ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ صاحب کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے ہمیں کفن لانے کے لئے بھیجا ہے۔ تمام قصبے میں دہشت اور خوف کی لہر دوڑ گئی تھی یہ ایک خوفناک صبح تھی جو پاکستان پر گیارہ سال تک جاری رہی۔ میں بیگم صاحبہ کے پاس گیا اور ان کو ڈپٹی کمشنر کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے بتایا کہ جب وہ کعبہ شریف گئی تھیں تو وہاں سے کفن لائی تھیں۔ اور پھر لرزتے ہاتھوں سے وہ کفن میرے حوالے کر دیا۔ دس پندرہ منٹ بعد مختار کار پھر آئے اور کہا کہ ڈپٹی کمشنر نے گڑھی خدا بخش بلوایا ہے جہاں بھٹو صاحب کا جسد خاکی لایا جانے والا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو لے کر گڑھی خدا بخش چلا گیا۔ جہاں وہ کچھ دیر ریسٹ ہاؤس میں بیٹھی رہیں۔ اور بعد میں اپنے بھائی کے گھر چلی گئیں۔ صبح آٹھ بجے کے قریب دو ہیلی کاپٹر بھٹو صاحب کی میت لے کر گڑھی خدا بخش پہنچ گئے۔ فوجی افسر بضد تھے کہ وہ دس منٹ کے اندر تدفین کریں گے اور جو لوگ بھٹو صاحب کا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں اس عرصہ میں دیکھ لیں۔ ہم نے اس ذلت آمیز برتاؤ پر احتجاج کیا اور ڈپٹی کمشنر شاہد عزیز نے ہمارا ساتھ دے کر دس منٹ کی پابندی ختم کرنے پر فوجی افسروں کو راضی کر لیا۔ اس کے بعد میت کو بھٹو صاحب کے بھائی کے گھر لے جایا گیا جہاں بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کا آخری دیدار کیا۔

جس وقت میت کو باہر لایا گیا اس وقت بھی وہ تابوت کے اندر تھی جو پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ تابوت کے ساتھ ایک مولوی کا تصدیق نامہ منسلک تھا کہ میت کو پورے اسلامی طریقہ کار کے مطابق غسل دیدیا گیا ہے اور دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد کوئی وجہ بتائے بغیر مجھے حراست میں لے لیا گیا۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ میں اپنا یہ بیان واپس لے لوں کہ میرے صاحب کو پھانسی نہیں دی گئی بلکہ تشدد کے ذریعہ ہلاک کیا گیا تھا۔ صاحب کی شہادت کے بعد میں ۱۹۸۲ء میں میونسپل کمیٹی نوڈیرو کا صدر منتخب ہوا تھا۔ اور بعد میں ایم آر ڈی (تحریک برائے بحالی جمہوریت) کے دوران محترمہ بیگم بھٹو کی ہدایت پر استعفیٰ دے دیا۔

www.bhutto.org

آپ بیتی

دوست محمد

۱۹۶۶ء میں جب میں پندرہ برس کا تھا تو بہاول بخش مرحوم مجھے مسٹر بابو سے ملانے لے گئے کیونکہ میں ملازمت کی تلاش میں تھا۔ مسٹر بابو ۷۰ کلفٹن پر متعین عملے کے نگران تھے۔ وہ مجھے شہید کے پاس لے گئے اور انہیں بتایا کہ وہ مجھے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے میرا نام دریافت کیا اور پھر بتایا کہ میرا سب سے اہم کام یہ ہو گا کہ بچوں کو صبح چھ بجے جگا دوں تاکہ وہ صحیح وقت پر اسکول پہنچ سکیں۔ ان کو یقین نہیں تھا کہ میں یہ کام کر سکوں گا لہٰذا انہوں نے مجھے خبردار کیا کہ وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ بچے تاخیر سے اسکول جائیں اور اگر میں ایک دن بھی اس میں ناکام رہا تو وہ دن میری ملازمت کا آخری دن ہو گا۔

میری ملازمت کو بیس سال گزر چکے ہیں۔ ان کی شہادت کے بعد بھی میں ان کے خاندان کے ساتھ رہا اور آج بھی بیگم صاحبہ کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں نے ان کو اور ان کے عزیز و اقربا کو اتنے قریب سے اور اتنا کچھ دیکھا ہے کہ شہید پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ اور پھر بھی مضمون مکمل نہیں ہو گا لیکن اس وقت میں آپ کو صرف ان واقعات تک محدود رکھوں گا جو فوری طور پر میرے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ "ہاکس بے" پر پکنک منانے کا فیصلہ کیا۔ اور

www.bhutto.org

مجھے گوشت اور سبزی وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ میں نے مطلوبہ اشیاء خرید لیں اور پھر ہم سب "ہاکس بے" پہنچ گئے۔ اور ایک ہٹ میں ڈیرہ جمالیا۔ شہید میرے پاس آئے اور کہا کہ میں تمام اشیاء لے آؤں اور مٹی کے تیل کا چولھا جلاؤں۔ اور یہ کہ وہ کھانا خود پکائیں گے۔

"لیکن جناب وہ کھانا کھائے گا کون جسے آپ پکائیں گے۔" میں نے ان سے سوال کیا۔

"تم جانتے ہو جب میں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

اور واقعی یہ بات صحیح ثابت ہوئی کیونکہ انہوں نے جو کھانا پکایا وہ مکمل طور پر لذیذ تھا اور ان کی مہارت ظاہر کرتا تھا۔ وہ جو کام بھی کرتے پوری توجہ اور انہماک سے کرتے تھے۔

رات نو بجے کا وقت تھا۔ شہید نے مجھے اپنے چھوٹے صاحب زادے "گجل بابا" (شاہ نواز بھٹو شہید) کو بلانے کو کہا۔ میں نے ان کو ان کے کمرے میں جا کر دیکھا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ اس پر شہید فکر مند ہو گئے اور ان کی تلاش میں میرے ساتھ باہر لان میں آ گئے۔ وہاں ان کو ٹینٹ کے قسم کی کوئی چیز نظر آئی جسے چار کھمبوں پر بستر کی ایک چادر کو تان کر بنایا گیا تھا۔ اس کے نیچے ایک خندق تھی۔ میں نے گجل بابا کو سہ پہر کے وقت وہاں خندق کھودتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ اس کے اندر ہی ہوں گے۔ میں نے اس کے قریب آ کر گجل بابا کو آواز دی اور وہ باہر آ گئے۔

"اتنی رات کو تم یہاں کیا کر رہے تھے" شہید نے سوال کیا۔

"میں ذرا کھیل رہا تھا" گجل نے جواب دیا۔

"تم نے یقیناً کوئی نیا کھیل ایجاد کیا ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ گجل بابا کو اندر لے گئے۔ دوسرے دن انہوں نے اس نقصان کے بارے میں دریافت کیا جو خندق کی کھدائی کی وجہ سے سبزہ زار کو پہنچا تھا۔ وہاں آنے والے لوگ تعجب میں تھے اور معلوم کر رہے تھے کہ وہ ٹینٹ نما چیز کیا ہے۔ میں نے صاحب سے عرض کی کہ میں آج ہی اس خندق کو مٹی سے بھر دوں گا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور کہا "گجل نے اس کو کھودنے میں سخت محنت کی ہے اسے برباد نہ کرو۔ کچھ دن بعد گجل کوئی اور کھیل ایجاد کر لے گا اس کے بعد تم اس کو بند کر سکتے ہو۔"

وہ اپنے بچوں کی سالگرہ کبھی نہیں بھولتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اور ان کے خاندان کے افراد بذریعہ ریل گاڑی کوئٹہ جا رہے تھے۔ مجھے راستے میں لاڑکانہ اترنا تھا۔ شہید نے مجھ سے کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ کوئٹہ چلوں اور پھر وہاں سے لاڑکانہ واپس آ جاؤں کیونکہ دوسرے دن مجھے

www.bhutto.org

لاڑکانہ میں بہت کام کرنا تھا۔ جب ہم کوئٹہ پہنچے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے مجھے بے نظیر صاحبہ کی سالگرہ کے انتظامات کرنے کے لئے روکا تھا۔ وہ بڑی ہی خوشگوار تقریب تھی کیونکہ باہر کے کوئی مہمان نہیں تھے اور کوئی لوازمات اور تکلفات نہیں کئے گئے تھے اور وہ بالکل ایک نجی تقریب کی طرح ایک چھوٹے سے کمرے میں منعقد کی گئی۔ میں نے شہید کو اس دن کی طرح خوش بہت کم دیکھا تھا۔

دن میں دو مرتبہ یعنی دوپہر کو اور پھر رات کو کھانے کے بعد وہ سگار جلا کر بیٹھ جاتے تھے۔ سگار پیتے وقت وہ گہری سوچ میں ڈوبے رہتے تھے اور اس وقت کسی کو مخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ جونہی وہ اپنا سگار جلاتے تھے میں ان کی لائبریری سے باہر آ جاتا تھا یہ ایک معمول تھا کہ وہ اس طرح ایک گھنٹہ گزارتے تھے اور پھر مجھے طلب کرتے تھے۔ ان کی لائبریری ان کی جنت تھی جہاں بیٹھ کر وہ باقی دنیا کو بھول جاتے تھے۔ افراد خاندان کے علاوہ کسی کو بھی لائبریری کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شاذو نادر وہ لائبریری میں کسی مہمان سے ملاقات کرتے تھے۔ اور ان کا ایسا کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہوتا تھا کہ آنے والا مہمان بڑی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا ہم مزید چوکس ہو جاتے تھے۔

"ایور نیو بک اسٹال" اور "سستی بک اسٹال" اپنی دکان پر آنے والی تمام نئی کتابیں ان کو بھیجتے تھے ایور نیو بک اسٹال کے مسٹر صفدر مہدی ہر نئی آنے والی کتابوں پر نظر رکھتے تھے۔ اور ان کو ۷۰ کلفٹن بھیج دیتے تھے۔ جہاں وہ علیحدہ رکھ دی جاتی تھی شہید ان میں سے اپنی پسند کی کتابیں رکھ لیتے تھے اور باقی واپس کر دی جاتی تھیں۔ لائبریری میں ایک سیڑھی بھی موجود تھی اور شہید کا حکم تھا کہ ہر کتاب اس کی مقررہ جگہ اور متعلقہ مضمون کے خانے میں رکھی جائے۔ وہ خود سیڑھی پر چڑھ جاتے اور میں ان کی ہدایات کے مطابق متعلقہ الماریوں میں رکھتا تھا وہ ہر کتاب کو اچھی طرح یاد رکھتے تھے اور طلب کرتے وقت یہ بھی بتا دیتے تھے کہ وہ کہاں رکھی ہے۔ ایک مرتبہ بیگم بھٹو غیر ملکی دورے سے واپس آئیں۔ جب وہ ۷۰ کلفٹن میں داخل ہوئیں تو بھٹو صاحب وہاں موجود تھے۔ بیگم صاحبہ نے ان کو بتایا کہ وہ ان کے لئے ایک خوبصورت تحفہ لائی ہیں۔

"یقیناً وہ کوئی کتاب ہو گی" شہید نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے" یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور شہید کے ہاتھ میں تھما دی۔ شہید نے کتاب پر نظر ڈالی اور مسکرا دیئے پھر مجھے بلایا اور کتاب دیتے ہوئے کہا کہ اس کو فوراً لائبریری میں رکھ دوں۔ بعد میں بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا کہ صاحب نے اور کیا کہا تھا۔ پہلے تو میں خاموش رہا لیکن بعد میں مجھے بتانا پڑا کہ وہ کتاب شہید کے

www.bhutto.org

پاس ایک ہفتہ قبل آ چکی تھی بیگم صاحبہ کو یقین نہیں آیا تو میں نے دونوں کتابیں لا کر دکھا دیں۔ شہید کا یہ معمول تھا جس دن بھی بازار میں کوئی نئی کتاب آتی وہ اسی دن اس کو خرید لیتے تھے۔

وہ تصویر کشی کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ائیر پورٹ سے گھر آتے ہوئے انہوں نے ہوٹل میٹروپول کے ایک شوروم میں ایک قالین لٹکا ہوا دیکھا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ میں وہ قالین خرید لاؤں۔ انہوں نے ایک کاغذ پر وہ تمام جانور اور پودے ڈرائنگ کر دیئے جو وہ اس قالین پر دیکھ آئے تھے۔ میں دکان پر پہنچا اور اس ڈرائنگ کی مدد سے فوراً اس قالین کو پہچان لیا جس پر ہو بہو وہی نمونہ بنا ہوا تھا جو شہید نے کاغذ پر بنایا تھا۔ وہ قالین آج بھی ۷۰ کلفٹن پر موجود ہے۔

ایک مرتبہ وہ بہت عجلت میں ۷۰ کلفٹن آئے اور اپنے سونے کے کمرے میں گئے اور صرف پانچ منٹ میں واپس آ کر ائیر پورٹ روانہ ہو گئے اور یہ معلوم کرنے کے لئے مجھے پنڈی سے فون کیا کہ وہ چار گلاس جو ان کے بیڈ روم میں رکھے تھے کہاں سے آئے تھے؟ میں ان کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ ان گلاسوں پر اوپر کی طرف سرخ رنگ کی پٹی تھی اور ان میں سے ایک تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے پھر لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ میں اوپر جا کر بیڈ روم کے دروازے کے بالکل سامنے والی الماری میں دیکھوں۔ میں فوراً اوپر کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک انہوں نے ٹیلی فون منقطع نہیں کیا تھا۔ یکایک مجھے یاد آیا اور میں نے ان کو بتایا کہ بیگم صاحبہ وہ گلاس نوادرات کی ایک دکان سے خرید کر لائی تھیں۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ان گلاسوں کو احتیاط سے رکھوں اور ان پر پالش نہ کراؤں کیونکہ وہ نایاب نوادرات ہیں۔ مجھے بڑا تعجب تھا کہ میں جو ہر روز اس کمرے کی صفائی کرتا تھا کس طرح بھول گیا کہ وہ گلاس خود میں نے وہاں رکھے تھے۔ جبکہ شہید نے نہایت عجلت میں ہونے کے باوجود یہ تک دیکھ لیا تھا کہ ان میں سے ایک گلاس ٹوٹا ہوا تھا۔

ہر چیز کی حفاظت کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ کراچی سے اسلام آباد پہنچ کر انہوں نے مجھے فون کیا۔ اس وقت میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی کے ایک سینما میں فلم دیکھ رہا تھا اور مجھے وہاں سے تلاش کیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے فون پر کہا کہ ان کا جام صادق سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے جو اس وقت بلدیات کا وزیر تھا۔ اور میں فوراً اس سے ملوں اور بتاؤں کہ شہید نے کراچی ائیر پورٹ جاتے ہوئے دیکھا کہ شاہراہ فیصل کے درمیان لگائی گئی گھاس گائیں چر رہی تھیں۔ شاہراہ فیصل پر عوام کا پیسہ لگا ہے جسے اس طرح برباد نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں اس وقت وہم

www.bhutto.org

وگمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن جام صادق سارے سندھ کے عوام کا پیسہ چر جائے گا۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کی کہ میرے گاؤں میں بجلی نہیں ہے۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ انہوں نے فوراً اپنے ذاتی معتمد (پرسنل سیکرٹری) کو بلوایا اور حکم دیا کہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ تین دن کے اندر مذکورہ گاؤں اور اس کے راستے میں آنے والے دیگر دیہات میں بجلی پہنچ جائے۔ چوتھے دن انہوں نے فون کر کے مجھ سے معلوم کیا کہ گاؤں میں بجلی پہنچ گئی ہے۔ ؟ میں نے ان کو بتایا کہ کام پوری رفتار سے جاری ہے اور اگلے دن تک بجلی پہنچ جائے گی۔

۷۰ کلفٹن پر ایک پرانا خاکروب ہے اور ابھی حیات ہے۔ اس کی عمر تقریباً اسی سال ہے۔ اس نے پی آئی اے میں لوڈر کی آسامی کے لئے اپنے داماد کی درخواست شہید کو پیش کی۔ شہید نے وہ درخواست اپنے بریف کیس میں رکھ لی اور اسے یقین دلایا کہ اس کا کام ہو جائے گا لیکن اس میں تھوڑا وقت لگے گا۔ اس کے بعد وہ اسلام آباد چلے گئے۔ دوبارہ ۷۰ کلفٹن آنے پر انہوں نے مجھے غلام مسیح کو بلانے کا حکم دیا۔ جب وہ آیا تو شہید نے اس سے کہا کہ وہ یہ تاثر نہ لے کہ میں اس کی درخواست کو بھول گیا ہوں۔ دراصل اس میں کچھ رکاوٹ تھی جو اب دور ہو گئی ہے۔

چوتھے دن تقرر کا حکم پہنچ گیا اور شہید نے بذات خود فون پر دریافت کیا کہ غلام مسیح کے داماد کو تقرر نامہ مل گیا یا نہیں؟

کراچی میں ایک رات تقریباً ڈیڑھ بجے انہوں نے گھنٹی بجائی اور جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا "مجھے نیند نہیں آ رہی ہے آؤ چہل قدمی کریں۔" ۷۰ کلفٹن میں ہم چہل قدمی کرتے ہوئے ملازمین کے کمروں کی طرف ان کی حالت دیکھنے چلے گئے۔ جب ہم پمپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ الیکٹریشن ایک بنچ پر سو رہا ہے۔ شہید کے دریافت کرنے پر الیکٹریشن نے بتایا کہ اس کے پاس کوئی کمرہ نہیں ہے۔ شہید نے اس کے لئے کمرہ بنوانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ہم صدر دروازے سے باہر آ گئے۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ وہ سفید کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھے اور ان کی آستینوں کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ حفاظتی گاڑیاں ان کے پیچھے چل پڑیں لیکن انہوں نے ان کو واپس کر دیا کہ وہ تنہائی اور پیدل چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن حفاظتی دستہ کچھ فاصلے پر ان کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ جمعہ کی رات تھی اور سڑک پر خاصا رش تھا کیونکہ لوگ حضرت غازی بابا کے مزار کی طرف رواں دواں تھے۔ شہید سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کو اس وقت اس حالت میں دیکھ کر کوئی پہچان نہیں سکے

www.bhutto.org

گا۔

میں نے عرض کیا "نہیں جناب لوگ آپ کو پہچان لیں گے" ۔ اور پھر ہم دو تلوار گول چکر تک پہنچ گئے۔ وہاں چوکیدار چارپائی پر سو رہا تھا۔ شہید وہاں رک گئے۔ اور کہا کہ انہوں نے جام صادق کو گول چکر کا کام جلد از جلد مکمل کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن اس نے اب تک نہیں کیا ہے۔

چوکیدار جاگ پڑا اور کہنے لگا یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ دن کے وقت آنا اور گول چکر دیکھ لینا" شہید نے بے وقت مخل ہونے پر چوکیدار سے معذرت کی اور اپنا تعارف کرایا۔ جس پر چوکیدار ہکا بکا رہ گیا۔ اور شہید سے اپنے لڑکے کے لئے ملازمت کی درخواست کی۔ شہید نے برجستہ جواب دیا "درخواست رات کے وقت نہیں دی جاتی دن کے وقت درخواست لے کر آنا۔ جب سب جاگ رہے ہوں" جلدی ہی وہاں ایک مجمع لگ گیا اور انہوں نے "جیئے بھٹو" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ حفاظتی دستہ فوراً آگے بڑھا اور بھٹو صاحب کو گھیرے میں لے لیا لیکن شہید نے پولیس کو لوگوں کو روکنے سے منع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں بارش تیز ہو گئی اور ہم ۷۰ کلفٹن واپس آ گئے۔ شہید پھر بھی نہ سو سکے۔ انہوں نے چپکے سے اپنی چھوٹی کار نکالی اور حفاظتی دستے کی نظریں بچا کر باہر نکل گئے ہم طارق روڈ، صدر، کلفٹن اور کیماڑی گئے اور جب واپس ۷۰ کلفٹن آئے تو صبح کے ساڑھ چار بجے تھے حفاظتی پولیس حیران تھی کہ جس وقت وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وزیراعظم اپنی خوابگاہ میں ہیں، وہ کراچی کی سڑکوں پر اپنی چھوٹی سی کار دوڑاتے پھر رہے تھے۔

میں وہ شام نہیں بھول سکتا جب ان کی حکومت کے برطرف کئے جانے کے بعد انہوں نے "المرتضیٰ" کے سبزہ زار میں بلایا تھا اور کہا تھا کہ ان کو ایک بھیانک مستقبل نظر آ رہا ہے اور وہ خوشی کے ساتھ اپنے ہر ملازم کو جو انہیں چھوڑنا چاہتا ہو سبکدوش کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے ان کو تمام عملے کی جانب سے یقین دلایا کہ ہم ان کے ساتھ زندہ تھے اور ان کے لئے خوشی سے جان بھی قربان کر دیں گے۔ اس بات سے وہ بہت خوش ہوئے۔ اور ہمارے جذبات کو سراہا۔

میری ان سے آخری ملاقات کراچی جیل میں ہوئی تھی جب ان کو لاڑکانہ سے گرفتار کر کے وہاں لایا گیا تھا۔ وہ بہت پرسکون اور پراعتماد تھے۔ اور مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ اس وقت صرف بیگم صاحبہ، بے نظیر بی. بی اور میر مرتضیٰ ۷۰ کلفٹن میں موجود تھے۔ صنم بی. بی اور شاہنواز بابا ملک سے باہر چلے گئے تھے۔

میں رو پڑا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ رونے کا وقت نہیں ہے اور یہ کہ میں ان کی بات غور

www.bhutto.org

سے سنوں اور ان کا پیغام بیگم صاحبہ تک پہنچا دوں کہ ایک دن کی تاخیر کئے بغیر میر کو لندن بھیج دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر میر چلے گئے تو ان کے حلقہ انتخاب لاڑکانہ کی نگرانی کون کرے گا۔ "کون سا الیکشن! کیسا الیکشن!؟۔ اب کوئی الیکشن نہیں ہو گا۔ یہ ملک اب وہ کچھ دیکھے گا جو اپنی تاریخ میں کبھی نہیں دیکھا ہو گا" وہ کافی برہم تھے "تم میری وہ بات کیوں نہیں سنتے جو میں کہہ رہا ہوں۔ بیگم صاحبہ سے کہو کہ میر نے ابھی تعلیم مکمل نہیں کی اور کل تک مجھے یہ اطلاع ملنی چاہئے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔"

میں نے انہیں خدا حافظ کہا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن صبح مرتضیٰ باہر چلے گئے اور ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ بی بی بے نظیر نے باہر جانے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کے پاکستانی عوام کے ساتھ کچھ وعدے تھے۔ اور پاکستانی قوم کو فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد کی قیادت کرنا تھی۔

خدا ان دونوں کی حفاظت فرمائے۔

www.bhutto.org

میرا قائد

محمد حنیف خان

یہ پاکستان کے عوام کے لئے بہت بڑا سانحہ اور بدقسمتی تھی کہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد جلد ہی بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح وفات پا گئے۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد ان کے دست راست قائد ملت لیاقت علی خان کو قتل کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کا سفینہ ناخدا کے بغیر ایک زبردست طوفان کی دیو قامت لہروں کے رحم و کرم پر ڈولنے لگا۔ کئی موقع پرست جائز یا ناجائز طریقے سے اقتدار حاصل کرنے کے لئے میدان میں کود پڑے۔ ان میں سب سے بدترین کھیل وہ تھا جو غلام محمد نے کھیلا۔ اس نے اپنے اختیارات اور غیر جمہوری اقدام کے ذریعہ ملک کے سیاسی افق کو بدترین نقصان پہنچایا اور ملک کے سیاسی اداروں کو تذبذب، افراتفری اور بدنظمی کے درمیان لا کھڑا کیا۔ اور پھر اس کے بعد غیر پارلیمانی، غیر اخلاقی اور شرمناک واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے اس نوزائیدہ ملک کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر ذلیل اور رسوا کر دیا۔ سازشوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا جو آخر کار ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء پر منتج ہوا اور جنرل محمد ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے۔

جنرل محمد ایوب خان نے باب الاسلام کے ایک خوبصورت بیرسٹر کو اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ وہ شخص آج دنیا میں "ذوالفقار علی بھٹو شہید" کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے نظریات

www.bhutto.org

اور فلسفہ کو "بھٹوازم" کا نام دیا گیا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

کون جانتا تھا کہ ایک دن وہ پروقار نوجوان پاکستانی عوام کا محبوب قائد بن جائے گا۔ اور عالمی سطح پر عظمت کی بلندیوں کو چھوئے گا۔ کون جانتا تھا کہ وہ پاکستان کے مظلوم عوام کو زبان دے گا۔ کون جانتا تھا کہ وہ جرأت، دلیری اور دانشمندی کی علامت بن جائے گا اور پاکستان، مسلم امہ اور تیسری دنیا کے غریب، پریشان حال، بے سہارا اور نظر انداز کئے ہوئے عوام کی آواز بن جائے گا۔ اس کے اندر میر کارواں بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ جس کا تصور علامہ اقبال نے اپنے مشہور اشعار میں کیا تھا۔

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

کابینہ میں شامل ہوتے ہی ان کی صلاحیتیں اجاگر ہونا شروع ہو گئیں۔ فارسی کا ایک مقولہ ہے "بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال" یعنی بزرگی کے لئے عمر کی نہیں بلکہ عقل و دانش کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہی صورت حال یہاں تھی۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر زیادہ نہ تھی لیکن جلد ہی انہوں نے نمایاں اور امتیازی حیثیت حاصل کر لی وہ ایک ولولہ انگیز، دلیر اور انتہائی قوت فیصلہ کے مالک تھے اور بڑے مستقبل شناس تھے۔

انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تاکہ پاکستان بین الاقوامی افق پر اپنا جائز مقام حاصل کر سکے۔ انہوں نے ایندھن، توانائی اور قدرتی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے کئی قابل ذکر اقدام کئے۔ ان کا سب سے اہم اور نمایاں قدم ایٹمی توانائی کے حصول کی طرف تھا۔ ان کی آنکھیں تیس سال آگے کی طرف دیکھ رہی تھیں یعنی آئندہ ایٹمی توانائی کی ضرورت۔ یہ بدنصیبی ہے کہ وہ لوگ جو بے ایمانی اور ناجائز طریقوں سے برسراقتدار آئے وہ اس اہم مسئلے کی سوج بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ یہ ان لوگوں کی نااہلی تھی کہ دیگر ترقیاتی منصوبوں کی طرح یہ مسئلہ بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا ان کا دائرہ کار مختلف ہے۔ ان کی ترجیحات مختلف ہیں اور وہ اس حیثیت کے اہل نہیں ہیں جو انہیں حاصل ہو گئی ہے۔ وہ عملاً مشہور پشتو شاعر عبدالعظیم بابا کے ان اشعار سے مطابقت رکھتے ہیں۔

زاغاں کینا ستہ پہ سرو سروی
طوطیاں ترلاند و زان ویرونہ گوئی

www.bhutto.org

کہ رڼیلان پاسیدل عبدالعظیم
پہ شریفانہ نانو اعتراضونہ گوئی

یعنی کوؤں نے سرو کے درخت کی چوٹی پر جگہ سنبھال لی ہے اور طوطے زمین پر بیٹھے اپنی حالت زار پر رو رہے ہیں۔ بدمعاش لوگوں نے شرفاء پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دی ہے۔

وفاقی وزیر برائے ایندھن، توانائی اور قدرتی وسائل رہنے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو ۱۹۶۰ء کی دھائی کے اوائل میں وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ یہ قلمدان زیادہ اہم اور روشن تھا اور ذوالفقار علی بھٹو ہی جیسے کسی باصلاحیت شخص کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔ وہ خصوصی طور پر اس کے لئے تعلیم یافتہ تھے اور ان کا اپنا رجحان بھی اسی طرف تھا۔ علاوہ ازیں وہ اس کے لئے خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ ان کو غیر ملکی یونیورسٹی میں بین الاقوامی قانون پڑھانے کا اعزاز حاصل تھا۔ بطور وزیر خارجہ انہوں نے کئی نمایاں اور یادگار اقدام کئے جس نے پاکستان کے وقار کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے متعدد بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کی اور وہاں اس وقت کے بین الاقوامی مسائل پر سیر حاصل اور مدبرانہ تقاریر کیں۔ بطور وزیر خارجہ ان کا ایک بڑا ہی اہم کارنامہ پاک چین، دوستی کی بنیاد رکھنا تھا۔ اور وہ اس کے خالق، فرد اول اور ستون تھے۔ اور میرے قائد کے بدترین نقاد بھی ان کے اس اعزاز سے انکار نہیں کر سکتے۔ وزیر خارجہ کی حیثیت سے ان کا کردار اس وقت نقطہ عروج پر پہنچا جب بھارت کے ساتھ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں اپنے ملک کا دفاع اقوام متحدہ میں کیا۔ ان کی تقاریر اور مؤثر انداز بیاں بھارت کے خلاف پاکستان کے ہاتھ میں ایک ناقابل شکست ہتھیار تھا۔ آزمائش کی اس گھڑی میں لوگ ریڈیو پر ان کی تقاریر سنا کرتے تھے اقوام متحدہ میں ان کی شیر جیسی گرج جس نے وہاں بیٹھے ہوئے بھارتی نمائندوں کو ہال سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہر پاکستانی نے ملک کے کونے کونے میں سنی۔ سراہا اور تعریف کی۔ اور اس طرح انہوں نے ہر محب وطن پاکستانی کے دل میں اپنا گھر بنا لیا۔ ہر پاکستانی ان کی دلیری، بے باکی اور سیاسی فتوحات پر فخر کرتا تھا وہ ہر پاکستانی کے ہیرو بن گئے تھے جن کے ساتھ ہر پاکستانی کا دل دھڑکتا تھا۔

میدان جنگ اور سیاسی فتوحات پر پاکستان کے دشمنوں نے پاکستان کے خلاف بین الاقوامی سطح پر سازشیں شروع کر دیں اور وہ جنگ جو میدان جنگ اور سیاسی میدان پر جیت لی گئی تھی ایوب خاں تاشقند کی میز پر ہار گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اعلیٰ ترین سطح پر بڑی کوشش کی کہ وہ یہ سودا نہ کریں لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ ایوب خان شکار ہو کر جال میں پھنس چکا ہے، انہوں نے اپنے آپ کو اس معاہدے سے الگ کر لیا۔ ان کی اس ناراضگی اور اختلاف کا اظہار ہر موقع پر ان کے

www.bhutto.org

چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ ناخوش اور دلبرداشتہ وطن واپس پہنچے۔ تاشقند میں پڑی ہوئی دراڑیں ناقابل مرمت تھیں۔ ایوب خان نے ان سے مصالحت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن شہید بھٹو کو پاکستان کا مفاد سب سے زیادہ عزیز تھا۔ انہوں نے گوہر ایوب کے لاڑکانہ آنے اور ان کو راضی کرنے کی کوشش کے باوجود اس مسئلہ پر بات کرنے سے انکار کر دیا اور شہید نے اقتدار پر اپنے عوام کو ترجیح دی۔ اور پھر وہ عوام کا حصہ بن گئے۔ اگرچہ جنگ ہاری جا چکی تھی لیکن عوام کو راکھ کے ڈھیر میں ایک چمکدار موتی مل گیا ان کا حقیقی قائد ان کے درمیان تھا اور ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو گئی تھی۔

میرے اندر بچپن سے ناانصافیوں کے خلاف شدید نفرت پرورش پا رہی تھی۔ میرا دل ہمیشہ ظلم اور غریبوں کی حالت زار دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا اور مجھے عرصے سے ایک ایسے قائد کی تلاش تھی جو عوام کی حالت بدل سکے اور ان کی زنجیریں توڑ کر ایک بہتر صبح کی امید دلا سکے۔

شہید بھٹو حکومت چھوڑنے کے بعد جب عوام سے آ ملے اور پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی تو میں نے محسوس کیا کہ تبدیلی کا وقت آ پہنچا ہے۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور عزیز و اقارب سے مشورہ کیا تو ان سب نے مجھے اس پارٹی میں شمولیت کی ترغیب دی اور ہمت افزائی کی۔ اس وقت ہمارے علاقے میں دو قابل ذکر سیاسی پارٹیاں مسلم لیگ (قیوم خان گروپ) اور خان عبدالولی خان کی "نیشنل عوامی پارٹی" سیاست کے میدان میں تھیں۔ ان دونوں پارٹیوں کے لیڈر مجھے اپنی پارٹیوں میں شامل کرنے کے لئے مجھ سے رابطہ کر رہے تھے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی کیونکہ ان کے پاس کوئی انقلابی لائحہ عمل نہیں تھا۔

شہید حیات محمد خان شیر پاؤ کو جو ایک نڈر پٹھان نوجوان تھے صوبہ سرحد میں پارٹی کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ وہ ایک ولولہ انگیز نوجوان تھے اور انہوں نے پی پی پی کو منظم کرنے کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خان سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ جب حیات محمد خان شیر پاؤ نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ زمین پر ہل چلا دیا گیا، آبپاشی کر دی گئی تھی اور اب صرف بیج بونا باقی رہ گیا تھا۔ پارٹی میں میری شمولیت کے بعد میرے خاندان پر خوف وہراس اور دھمکیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ علاقے کی سیاسی انتظامیہ فوراً حرکت میں آ گئی اور ڈرانے دھمکانے کی تمام کارروائیاں جو وہ کر سکتی تھی شروع کر دی گئیں۔ میرے والد کو جن کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی اور عرصہ دراز سے قبیلے کے سردار چلے آ رہے تھے۔ ہر چیز سے محروم کر دیا گیا۔ مجھے اپنے والد کے مکان سے نکال دیا گیا کیونکہ مجھے ان تمام پریشانیوں کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ تقریباً دو

www.bhutto.org

سال بعد میرے والد نے میرے ساتھ مصالحت کر لی اور مجھے گھر لے آئے اور میری حمایت شروع کر دی جس سے مجھے بہت تقویت ملی اور میں نے اور زیادہ ولولے اور پوری قوت کے ساتھ پارٹی کے لئے کام شروع کر دیا۔

۱۹۶۹ء کے اواخر میں ذوالفقار علی بھٹو نے مالاکنڈ ایجنسی، دیر اور سوات کا دورہ مرتب کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اپنے قائد سے ملنے والا تھا۔ ہم ایک بڑے جلوس کی شکل میں "سخ کوٹ" میں ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے دورے کے راستے پر مالاکنڈ ایجنسی سوات اور دیر سے پہلے آتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے ہی ان کو خوش آمدید کہنا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کو پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا اور ان کی شخصیت اور کردار کا رعب میرے ذہن پر اس شدت سے چھایا ہوا تھا کہ میں واقعی بہت گھبرا رہا تھا۔

آخر کار انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ان کا قافلہ نمودار ہوا۔ مجمع کے اندر جوش و خروش اور بے چینی پیدا ہونے لگی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو میں نے آگے بڑھ کر ان کی کار کا دروازہ کھولا اور میرا قائد میرے سامنے تھا۔ صنوبر کے درخت کی طرح دراز قد، پروقار اور پرکشش نظر آنے والا۔ ہم نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ اور انہوں نے مجھ سے سوال کیا "کیا حال ہے حنیف! یہاں پر عوام کا کیا حال ہے" یہ وہ پہلے الفاظ تھے جو میرے قائد نے مجھ سے کہے اور آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں نے ان کو جواب دیا "جناب میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہم سب آپ کی راہنمائی کے منتظر ہیں۔"

وہ مسکرا دیئے اور پھر دوسرے لوگوں سے مصافحہ کرنے کے بعد ہم نے مختلف دیہات کا دورہ شروع کر دیا اور شام کو "توڑ موڑ" ریسٹ ہاؤس پہنچے جو ایک چکر دار سڑک پر پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے۔ وہاں سے نیچے کی طرف ہوتے ہوئے ہم مالاکنڈ سے سوات پہنچے جہاں میرے قائد نے رات بھر قیام کرنا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں ہم نے تفصیل سے گفتگو کی اور انہوں نے ہمارے سامنے وہ سارا لائحہ عمل بیان کیا جس کا ملک کے لئے انہوں نے منصوبہ بنایا تھا۔ جس پر ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا اور ہمارے اندر روشنی پیدا ہوئی اور ہم اپنے آپ کو بلندیوں پر اڑتا محسوس کرنے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی پراسرار طاقت میرے جسم کے اندر عود کر آئی ہے۔ میرے اندر حوصلہ اور طاقت پیدا ہو گئی اور مجھ میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ میں تمام رکاوٹوں کو دور کر کے دنیا بدل ڈالوں گا۔ ان کی رفاقت اور رہنمائی ایک عجیب معجزانہ تاثر رکھتی تھی۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر

www.bhutto.org

شعیبی سے کلیمی دو قدم ہے

صبح دو بجے میں نے اپنے قائد سے اجازت چاہتے ہوئے ان کو اپنے گاؤں "دھیری جولا گرام" میں اپنے حجرے پر کھانے کی دعوت دینے کی ہمت کی۔ پھر میں اپنے گاؤں چلا گیا جو ریسٹ ہاؤس کے شمال مغرب میں واقع ہے۔

میں اپنے گھر جا کر سو گیا لیکن چند گھنٹوں کے بعد بارش کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بارش جس کو خوشی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث سمجھا جاتا ہے عام طور پر ہمارے علاقے کے لئے پریشانی کا پیغام لے کر آتی ہے۔ کیونکہ بارش میں ہمارے گاؤں کو آنے والی کچی سڑک کیچڑ اور دلدل میں بدل جاتی ہے اور ایک مقام پر تو جو ہمارے گاؤں سے مشرق کی طرف ایک کلو میٹر کے فاصلے پر ہے، گاڑیوں کی آمدرفت ناممکن ہو جاتی ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے قائد کو پریشان نہیں کروں گا اور دعوت منسوخ کر دوں گا۔

میں صبح اٹھا اور پیدل ہی ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ بھٹو صاحب رات زیادہ دیر تک جاگنے کی وجہ سے ابھی سو رہے ہوں گے لیکن میں وہاں ان کو کھلی جگہ میں چہل قدمی کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نہا دھو کر اور باقاعدہ کپڑے پہن کر وہاں کے منظر اور بادِ نسیم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور پھر ہم دونوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا۔ میں مناسب وقت اور الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کس طرح ان سے کھانے کی دعوت منسوخ کرنے کی درخواست کروں جس کی وجہ سڑک کی بے انتہا بدحالی تھی۔ آخر کار میں نے اردو میں کہنا شروع کیا "جناب وہ جو کل رات میں نے آپ کو کھانے کے لئے گاؤں مدعو کیا تھا..... لیکن بارش....." میں ابھی جملہ مکمل نہیں کرنے پایا تھا کہ میرے قائد نے کہا "ہاں ہاں حنیف! مجھے یاد ہے۔ بارش کی وجہ سے موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ بتاؤ کب چلیں" میں نے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور صرف اتنا کہہ سکا "جناب بارہ بجے"۔

اس کے بعد میں نے فوراً اپنے ملازم کو گاؤں دوڑایا تاکہ وہ کھانے کا انتظام کرے اور کافی لوگ اس خاص دشوار گزار دلدلی جگہ پر جمع رکھے تاکہ پیدا ہونے والی کسی افتاد سے نمٹا جا سکے۔

ہم بارہ بجے روانہ ہو گئے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا اور راستے میں آنے والی دشواری کی وجہ سے فکر مند تھا۔ گاڑی کیچڑ میں ادھر ادھر جھول رہی تھی لیکن خدا کا شکر ہم راستے سے گزر گئے اور وہ مقام آ گیا جو سب سے زیادہ دشوار گزار تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں ایک بڑا مجمع

www.bhutto.org

اپنے قائد کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ جب کار وہاں پہنچی تو لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے کار اپنے ہاتھوں میں اٹھائی اور اسے اس دشوار مرحلے سے گزار دیا۔ بھٹو شہید لوگوں کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے نصیحت کے انداز میں کہا "حنیف ان لوگوں کو اور اس سڑک کو کبھی نہ بھولنا"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے قائد کی اس ہدایت کی تعمیل کر دی ہے۔ وقت آنے پر یہ سڑک ان تمام طویل تعمیراتی کاموں میں سرفہرست تھی جو ہماری حکومت میں کئے گئے۔ بعد میں شہید بھٹو اپنے وزارت عظمیٰ کے دور میں کئی مرتبہ میرے گاؤں آئے۔ ہر مرتبہ وہ اس پکی اور چوڑی سڑک کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے جو میرے گاؤں کو جاتی تھی۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں "پاکستان پیپلز پارٹی" مغربی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے منظر عام پر آئی اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں تمام دوسری پارٹیوں کا صفایا کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے میدان مارا۔ یحییٰ خان جس نے ابتداء میں انتخابات میں ایمانداری کا دم بھرا تھا۔ اقتدار کا مزا چکھ چکا تھا۔ وہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل کرنے پر آمادہ نہ تھا۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء کی پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہو گیا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ مغربی سرحدوں پر پاکستان کا پانچ ہزار مربعہ میل کا علاقہ بھارت کے قبضے میں چلا گیا اور نوے ہزار فوجی قیدی بنا لئے گئے "جنرل نیازی" جسے "ٹائیگر نیازی" کہا جاتا تھا، بھارت کے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈالتے وقت ٹائیگر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مغربی حصے میں خفت کی وجہ سے ہر شخص کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ کیونکہ عسکری تاریخ میں مسلمانوں کی اتنی شرمناک ذلت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جنرل یحییٰ خان کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور وہ بھٹو شہید کو ٹیلیکس پر ٹیلیکس بھیجے جا رہا تھا کہ اقوام متحدہ سے فوراً واپس آ کر اقتدار سنبھال لیں۔ آخر کار بھٹو واپس آ گئے اور اس نے اقتدار ان کو منتقل کر کے اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے آزاد کر لیا، ذوالفقار علی بھٹو نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اقتدار سنبھالتے ہی ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کر کے اس کے حوصلے بلند کئے اور ایک نیا پاکستان بنانے کا عہد کیا۔

انہوں نے متعدد اہم فیصلے کئے۔ شملہ معاہدے کے تحت اپنے جنگی قیدی اور مقبوضہ علاقے واپس لئے۔ یہ ان کی ذہانت اور سیاست تھی کہ اپنی کمزور صورت حال کے باوجود اصولوں پر سودا نہیں کیا۔ آج ان کے مخالفین بھی اس یادگار سمجھوتے کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر

www.bhutto.org

سکتے اور میرے قائد کی سیاست اور تدبر پر دسترس اور مہارت کے معترف ہونے پر مجبور ہیں۔

شہید بھٹو نے اپنے تاریخی دور حکومت میں زندگی کے ہر شعبے میں مثبت تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے کئی یادگار فیصلے کئے جن کی تفصیل بیان کرنا اس مضمون میں ممکن نہیں۔ بہرحال چند اہم کارنامے بیان کرنے کے لئے ہم ۱۹۷۳ء کے آئین سے ابتداء کر سکتے ہیں جو ملک کی آئینی تاریخ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

مختلف نظریات اور مکتبہ فکر رکھنے والے قائدین جن کے منشور اور پروگرام بھی مختلف ہوں آئین جیسی حساس دستاویز پر متفق کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

پورٹ قاسم کی تعمیر، کراچی اسٹیل مل، جوہری توانائی کی ابتداء، اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد، قومی شناختی کارڈ کی ابتداء، حصول پاسپورٹ کے لئے آسان طریقہ کار، ملک میں اور ملک سے باہر خصوصاً مشرق وسطیٰ میں روزگار کے مواقع، غریبوں کی عزت نفس کی بحالی، محنت کشوں کے وقار کی بلندی، زرعی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات، صنعتی اصلاحات، این ڈی وی پی، این سی سی، غریب طبقے کے مقابلے میں امیر کو ظالمانہ مراعات کا خاتمہ، خود انحصاری اور دیگر لاتعداد اقدام ان کے کارناموں میں شامل ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے افواج کو بہت مضبوط کیا اور ان کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لئے اقدام کئے۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ پاکستان کو جوہری توانائی کا ملک بنائیں گے چاہئے اس کے لئے قوم کو گھانس کھانی پڑے۔

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب کاری ہے
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

اپنی کارگزاری پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے مقررہ وقت سے قبل ہی عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ قوم پوری طرح مطمئن تھی جس کی وجہ سے پی پی پی دوبارہ واضح اکثریت سے واپس آئی اور ایک بار پھر عوام کی حکومت نے کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن یہودیوں کے طرفداروں کے گروہ نے ان کو اپنے لئے خطرہ محسوس کیا اور پھر "تل ابیب" میں ان کو اکھاڑ پھینکنے کی سازش تیار کی گئی۔ یہودی جانتے تھے کہ وہ پاکستان میں موجود اپنے ایجنٹوں سے یہ کام لے سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے زر خرید لوگوں کو اس کام کا اشارہ دے دیا اور اپنے خزانوں کے منہ ان کے لئے کھول دیئے۔ ملک میں ڈالروں کا سیلاب آ گیا۔

پی این اے نے اسلام کے نام پر لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مسجد کے منبروں اور خطبہ گاہوں سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے خلاف تحریک شروع کی گئی تھی محمد بن قاسم کو بھی ایک مسلمان خلیفہ کی ہدایت پر سندھ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ یوسف بن تاشفین اور موسیٰ بن ناصر کو بھی

www.bhutto.org

مسلمان خلیفہ کے حکم پر بیڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ دھوکہ بازی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اسپین (ہسپانیہ) میں مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت کے زوال اور پر شکوہ خلافت عثمانیہ کی تباہی کا باعث بھی یہ ہی لوگ تھے۔ ۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو بھی میرے قائد کی حکومت کا تختہ دشمن کے غلاموں نے الٹا تھا۔

تاریخ اسی طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے

میرے قائد کو بھی پابہ زنجیر کر کے سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا۔ ان کو مکمل طور پر منظر سے ہٹا دینے کے لئے ایک جھوٹے مقدمہ قتل میں ملوث کر دیا گیا۔ جس کی آخری سماعت عدالت عظمیٰ میں ہوئی۔ سماعت کے آخری دن میں نے ان کو عدالت عظمیٰ میں پولیس کی حراست میں دیکھا۔ میں ان کو اس حال میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مجھے دیکھ کر شہید میرے قریب آئے اور کہا "نہیں! نہیں! حنیف پارٹی کے لئے کام کرنا ہے۔ پارٹی کو آگے لانا ہے۔ ہمت کرنا ہے" یہ تھے میرے قائد کے آخری الفاظ جنہوں نے مجھے ہمت دی۔ میں ان کے سامنے شرمسار تھا۔ وہ تقریباً دو سال سے تشدد برداشت کر رہے تھے۔ ان کو جسمانی، جذباتی اور دماغی اذیت دی گئی تھی۔

ایک دولت مند ترین خاندان کے فرد، بہترین درسگاہوں میں تعلیم پانے والے اور ایک آرام دہ زندگی بسر کرنے والے میرے قائد کو ناقابل بیان تکالیف کا شکار بنایا گیا لیکن انہوں نے پھر بھی اپنے آپ کو قائم رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں قتل کیا جا رہا ہے لیکن وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ انہوں نے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنا سر بلند رکھا۔ انہوں نے ان عظیم مسلمان صوفیوں جیسا طریقہ کار اپنایا جو اس قسم کے حالات میں متزلزل نہیں ہوئے تھے۔ اور آخر کار انہیں مار دیا گیا۔ انہوں نے قوم کے لئے غریب عوام کے لئے اور قوم کی سربلندی کے لئے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کیا اور مسکراتے ہوئے موت کو خوش آمدید کہا۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

وہ ہمیشہ ایک نئے پاکستان کی باتیں کرتے تھے۔ ایک مضبوط پاکستان، ایسا پاکستان جو استحصال سے پاک ہو۔ وہ اسلام کی سربلندی، سماجی انصاف چاہتے تھے۔ وہ جہالت، بیماری، بھوک، افلاس اور ظلم کا خاتمہ اور غلامی کی زنجیریں توڑ دینا چاہتے تھے۔ وہ انسان پر انسان کی برتری کے خلاف تھے۔ خارجہ تعلقات میں وہ برابری کے اصول کے قائل تھے۔ وہ غریبوں کی عزت نفس چاہتے تھے۔ انہوں نے غریب، نادار اور ضرورت مند لوگوں کو روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا تہیہ کیا

www.bhutto.org

ہوا تھا۔ وہ ایک سچے فرزند اسلام تھے اور جارج برنارڈ شا کی کتاب "مشرق کی بیداری" میں بیان کئے گئے خیالات کے پیرو کار تھے۔

انہوں نے اسلام کے پرچم کو اپنے خون سے رنگا اور اس سے ہمارے لئے ایک پیغام لکھ دیا کہ ہم کو مظلوم کے حقوق کی خاطر لڑنا چاہئے۔ ہم ان کے اس پرچم کو بلند رکھیں گے اور ان کے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔

نقش ہے سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اب جب میں ماضی کے حوالے سے دیکھتا ہوں تو چیزیں بہت مختلف نظر آتی ہیں۔ میں کسی ایسی دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں ہمارے ناصح، استاد اور ہمارے راہبر اور قائد ذوالفقار علی بھٹو موجود نہ ہوں۔ اور جب میں گہرائی سے غور کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ شہید کبھی نہیں مرتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اور وہ اب بھی ہمیں ہدایات اور حوصلہ دے رہے ہیں۔ ان کی بیٹی بے نظیر بھٹو ہماری قیادت کر رہی ہیں۔ جو انہی کی طرح حوصلہ اور فہم وفراست کی حامل ہیں وہ وفاق کی علامت ہیں۔ پاکستان کے دشمن ان سے خوفزدہ ہیں اور ان کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں ہم قبر تک ان کا پیچھا کریں گے۔ ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔

نقاروں کو پھر آخری ضرب کے لئے تیار کر لیا گیا ہے۔ اور آخری وقت آن پہنچا ہے۔

بھٹو زندہ باد! پاکستان زندہ باد

ہزار چشمہ تیرے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

www.bhutto.org

بھٹو بطور وزیر اعظم

میجر جنرل (ریٹائرڈ) نصیر اللہ خان بابر

مجھے جو فریضہ سونپا گیا ہے وہ شہرت یافتہ "مشن امپاسیبل" کی طرح ہے۔ مجھے ایک عظیم اور قد آور شخصیت کے بارے میں لکھنے کو کہا گیا ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ میری تحریر ان کی شخصیت کے صرف ایک پہلو کا احاطہ کرے یعنی "بھٹو بطور وزیر اعظم۔"

میں اپنے مضمون کی ابتدا شیکسپیئر کے ان الفاظ سے کروں گا کہ "لباس شخصیت کو سنوارتا ہے۔" دوسری مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی شخص کو اس کے عہدے کی شان و شوکت باعزت بناتی ہے، لیکن یہاں بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ مسٹر بھٹو کا کردار اور ان کا کمال تھا جس نے وزارت عظمیٰ کے عہدے کو چمک اور عزت عطا کی۔

انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ رہنے بسنے والوں کے ذہنوں پر اپنے نقوش چھوڑے لیکن چند ایک منتخب لوگ ہی اس میں کامیاب ہو پاتے ہیں، اور مسٹر بھٹو ایسے ہی منتخب لوگوں میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے ان لوگوں کے ذہنوں پر گہرے اور نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں جنہیں ان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ بلاشک و شبہ وہ تاریخ کی پیداوار تھے۔

۱۹۷۱ء کے افسوس ناک واقعات کے بعد جب قوم شرم ناک رسوائی سے دو چار تھی۔ اور

www.bhutto.org

قوم کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ جب قوم ہی نہیں بلکہ پوری مسلم امہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ دوہرائے جانے پر گنگ ہو گئی تھی اور ایک قائد کی تلاش میں تھی۔ ایک کردار قائد کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ مسٹر بھٹو اس کردار کی ادائیگی کے لئے سامنے آئے۔ یہ ایک تاریخی موڑ تھا جب قدرت نے ایک دل شکستہ اور حوصلہ ہاری ہوئی قوم کو عالمی برادری میں ایک نئی منزل پر پہچانے کے لئے مسٹر بھٹو کا انتخاب کیا اور مسٹر بھٹو قوم کے حوصلے کی علامت اور قوم کی امنگوں کی تصویر بن گئے۔ اور وہ بھی ایسے تشویش ناک موڑ اور تاریک وقت پر جب زیادہ تر قائدین اس فرض کی ذمہ داری سنبھالنے سے پہلو تہی کر رہے تھے۔

مسٹر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے بعد کے مہینوں میں قومیانے کے عمل، عام اقتصادی حکمت عملی، محنت کشی، حدود ملکیت اراضی، پولیس اور عدلیہ سے، متعلقہ اصلاحات پر کام شروع کیا گیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیا سماجی دستور جو وقت کی ضرورت کا آئینہ دار ہو پر ۱۹۷۳ء کے آئین کے شکل میں کام شروع کیا گیا۔ جس نے سیاسی ڈھانچے کو یکسر بدل دیا۔ قائد اعوام کا سب سے بڑا مقصد صرف بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کی نشاندہی کرنا نہیں تھا بلکہ کامیابی کے ساتھ اس پر عمل در آمد کے لئے عوام کی سیاست کو روشناس کرانا تھا۔ انہوں نے عوام کو روائتی معززین اور جاگیرداروں کے شکنجے سے آزاد کرایا۔ وہ سیاست کو وڈیروں کے ڈرائنگ روم سے عوام کی سطح پر لے آئے یعنی نچلے طبقے کے لوگ (جن کو وہ "کمی" کہتے ہیں) اور جاگیردار وڈیرے، خان، سردار آپس میں منسلک کر دیئے۔ صدیوں پرانی رویات توڑ دی گئیں پی پی پی نجات کی علامت اور مسٹر بھٹو نجات دہندہ قرار پائے۔

اشتراکی اقتصادیات

انسانی دماغ ہمیشہ سے معاشرے میں مقصدیت کی فتح کی ایک لا متناہی خواہش رکھتا ہے۔ اور اس کی یہ خواہش کبھی کامیاب اور کبھی ناکامی سے دو چار ہوتی ہے۔ انقلاب اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب دماغ کوئی نیا نظریہ پیش کرے۔ تقریباً دو دہائیوں سے رونما ہونے والے واقعات (مارشل لاء) اور اس کے نتیجے میں چند منتخب خاندانوں (۲۲ خاندانوں) کے استحصال، ظلم اور جبر نے ایک انقلابی پارٹی اور منشور کے لئے موقع فراہم کیا۔

اس کا سہرا مسٹر بھٹو کے سر ہے کہ انہوں نے جاگیرداروں اور دولت مند صنعت کاروں کی جگہ ایک نئی سوچ دی۔ ایک ایسی سوچ جس کا ثمر ضیاء کے مارشل لاء دور میں حاصل ہونا تھا۔ اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں معاشرے کے لئے روشن مواقع فراہم کرنا تھا۔ جیسا کہ آج نج کاری اور

www.bhutto.org

آزاد معاشیات کا منشور پیش کیا جارہا ہے۔

جدید انقلاب عام طور پر خیالی دنیا میں بسنے والے جذباتی لوگوں سے منسوب ہوتا ہے۔ اس امید پر کہ اس انقلاب سے عزت نفس، معاشرتی ڈھانچے اور انفرادی رویئے میں تبدیلی آئے گی۔

پارٹی کے منشور اور شہید نے تقاریر کے ذریعے جن میں زیادہ تر انسانی اقدار اور آئندہ کے لئے جدید ڈھانچے کی چاشنی موجود تھی۔ اپنے نظریات کو عوام تک پہنچایا اس امید پر کہ اس سے ان کے اندر انقلابی عمل شروع کرنے کی تحریک ہوگی۔

اس دوران ان کی تقاریر ایک مکمل معاشرتی آزادی، مساوات، سماجی شعور، امن، انصاف اور انسانی اقدار کی بلندی اور دیگر مراعات جو انسان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پاکستان کے لوگوں کو عالمی برادری میں اپنے جائز اور باعزت مقام پر واپسی کی امید دلاتی تھیں۔ خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے لوگوں کے برعکس کسی ایسی منزل کی نشاندہی نہیں کی۔ جہاں پہنچا نہ جاسکتا ہو یا جس کا دنیا میں کوئی وجود نہ ہو۔ بلکہ اس منزل کو اس کے مستقبل میں دکھا دیا اور آخر میں اس کے حصول کو نہ صرف ممکن بلکہ یقینی بنایا۔ دوبارہ سے ایک نئی زندگی شروع کرنے کی راہنمائی کے لئے ایک نجات دہندہ آن پہنچا۔ آہستہ لیکن واضح طور پر عوام نے اصلاحات اراضی، محنت کشوں کی انجمنوں کے قیام کو آئینی تحفظ کی صورت میں حقیقت بنتے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ عوام فطری طور پر شہید کے اس انقلابی پروگرام میں ان کے ساتھ ہو کر ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو گئے۔ انہوں نے شہید کی ہر آواز پر مثبت انداز میں لبیک کہا اور لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر شملہ بات چیت کے لئے روانگی سے قبل لاہور کے قذافی اسٹیڈیم میں ان کا جلسہ عام اس کی ایک مثال ہے۔

خارجہ حکمت عملی

عوام کی امنگوں کی علامت بن کر وہ شملہ روانہ ہو گئے۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی شخص نے اتنے قلیل عرصہ میں قوم کا حوصلہ بلند نہیں کیا اور نہ زندہ رہنے کے لئے نئے چیلنج قبول کرنے کے قابل بنایا۔

بھارت کا سابقہ ایک بالکل نئی اور تبدیل شدہ قوم سے پڑا ایک ایسی قوم جو تن تنہا ہر قسم کے حالات کا دلیری سے مقابلہ کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ مذاکرات کے دوران اپنی فہم و فراست سے اپنے مد مقابل کی اس کمزوری کا انداز لگا لیا کہ وہ ایک تاریخی شخصیت بننا چاہتی ہے۔ جس وقت مذاکرات مکمل طور پر ناکامی کی طرف جارہے تھے انہوں نے مسز گاندھی سے علیحدہ گفتگو کر کے ان

www.bhutto.org

کو اپنا ہم خیال بنالیا جس کے تعجب خیز اور مفید نتائج بر آمد ہوئے یعنی پاکستان کے جنگی قیدیوں اور مقبوضہ علاقے کی واپسی اور مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے انتخاب۔ پاکستان کے نکتہ نظر سے یہ معاہدہ ایک مثالی کامیابی تھا اور ان کے بعد آنے والی ہر حکومت نے بھارت کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں اسے استعمال کیا۔

مسٹر بھٹو امور خارجہ میں خاص فضیلت اور مہارت رکھتے تھے۔ اپنی ذہانت سے انہوں نے پاکستان کی خارجہ حکمت عملی میں اہم تبدیلیاں کیں۔ جغرافیائی تبدیلیوں میں اپنی غیر معمولی ذہانت سے انہوں نے محسوس کیا کہ مشرقی پاکستان الگ ہو جانے کی وجہ سے بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ کہ "سیٹو" (SEATO) اب بے مقصد ہو گئی ہے اور جنوبی ایشیا اب مزید اس کا میدان عمل نہیں رہا ہے لہٰذا انہوں نے اس سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ اور اب پاکستان کو اسلامی قدروں اور ورثے کی طرف جانا تھا۔ ان کے خیال میں پاکستان ایک اہم اور بڑے اسلامی علاقے کے لئے مشرق میں ایک محفوظ سرزمین تھا۔ لہٰذا اب پاکستان کا تعلق زیادہ تر وسط ایشیا کے معاملات سے ہو گا اور اس کی سیاست اور عالمی عملداری کا رخ اب برادر مسلم ممالک کی طرف ہو گا۔ نہ صرف ترکی اور ایران جن کے ساتھ پہلے ہی "سینٹو" (CENTO) کے توسط سے خصوصی تعلقات موجود ہیں بلکہ بااثر عرب ممالک ساتھ بھی۔

۱۹۷۳ء ایک نعمت غیر مترقبہ بن کر آیا۔ اس سال عرب اسرائیل جنگ اور اس کے نتیجے میں تیل کی پابندی (شہید کے دفاع کی اختراع) نے اقتصادی ماحول اور جغرفیائی صورت حال کو ایک نیا زاویہ نظر دیا۔ مسلم ممالک نے سخت رویہ اختیار کر لیا۔ شاہ فیصل کی طرف سے فوری طور پر "اوپیک" (OPEC) کے ڈرامائی قیام نے عالمی سطح پر ایک طاقتور انجمن کی صورت میں راتوں رات خلیجی ریاستوں کی قسمت بدل ڈالی اور چھوٹے ممالک عظیم اقتصادی طاقت بن گئے۔ مسٹر بھٹو اس قدر ذہین تھے کہ انہوں نے اندازہ لگالیا کہ یہ ان سب کے فوری باہمی مفاد میں ہو گا۔ خارجہ حکمت عملی کو پہلے سے زیادہ فعال بنایا گیا تاکہ عرب ممالک کی ان کے مفادات میں مدد کی جائے۔ مسٹر بھٹو نے یہ کھلا اعلان کیا کہ پاکستان کی مسلح افواج دنیائے اسلام کے لئے ہر وقت حاضر ہیں۔ چاہے وہ اسرائیل کے خلاف استعمال کی جائیں (شام کی جنگ کے دوران پاکستانی پائلٹ مہیا کئے گئے) یا ترکوں کی حمایت میں قبرص کے خلاف۔ انہوں نے ہنر مند، جزوی ہنر مند کارکن، انجینئرز، اساتذہ، فوجی ماہرین یا کسی بھی شعبہ کی ضرورت پر عرب ممالک بھیجنے کی پیش کش کی۔ اس کے علاوہ کئی مشترکہ منصوبے بھی شروع کئے گئے۔ عرب ریاستیں شدت سے ترقی کی خواہش مند تھیں اور پاکستان اپنے ترقیاتی ذہن رکھنے والے کارکنوں کے ذریعے ان سے تعاون کرنے پر تیار

www.bhutto.org

تھا۔ یہ تعلقات چونکہ باہمی دلچسپی کے تھے اس لئے وقت کے ساتھ مستحکم ہونے لگے۔

اس منصوبے پر عملدر آمد کے لئے مسٹر بھٹو نے متعدد بار عرب ریاستوں کا دورہ کیا اور شاہ فیصل، معمر قذافی، یاسر عرفات اور حافظ الاسد سے گہرے اور قریبی تعلقات کو ترقی دی۔

یہاں میں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۹۷۶ء کے اواخر میں مسٹر بھٹو اپنے پشاور کے دورے پر تھے کہ ان کو سری لنکا میں پاکستانی سفیر کا پیغام موصول ہوا کہ کولمبو سے اپنی وطن روانگی کے وقت سفیروں کی قطار سے ملتے وقت جب کرنل قذافی پاکستانی سفیر کے پاس پہنچے تو انہوں نے سفیر سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ راستے میں اپنے بھائی بھٹو سے ملنا چاہتے ہیں۔ پاکستانی سفیر فوراً اپنے سفارت خانہ پہنچے اور وزارت خارجہ کی وساطت سے یہ اطلاع بھیجی۔ چند منٹ بعد ہم یہ خبر سن کر افراتفری میں پڑ گئے کہ کرنل قذافی کا ہوائی جہاز بھارت کے شہر بھٹنڈا سے گزر کر پاکستانی علاقے میں داخل ہونے والا ہے اور پشاور کی طرف رواں دواں ہے۔ پینتالیس منٹ کے بعد وہ ہمارے پاس پہنچ گئے اور ان کا پشاور کے ہوائی اڈے پر استقبال کیا گیا۔ پشاور نے جو تکوں اور کبابوں کے لئے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اپنی روائتی مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے معزز مہمان اور ان کے ساتھیوں کی خوب خاطر مدارات کی۔ میں یہاں وہ پریشانی بیان نہیں کروں گا جو پروٹوکول کے سلسلے میں وہاں پیدا ہو گئی تھی۔ صورت حال کچھ بہتر ہوئی تھی کہ پھر افراتفری پیدا ہو گئی کیونکہ برادر قذافی نے واپس وطن جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کے جہاز میں ایندھن بھرنے کے دوران ان کو شہر اور چھاؤنی کی سیر کرائی گئی۔ ان کو "درہ" لے جانے کا بھی پروگرام تھا بشرطیکہ وقت ہوا۔ وہاں کوئی تھکا دینے والی رسومات نہیں ہوئیں اور نہ پروٹوکول ہی دیا جا سکا۔ اسی قسم کا واقعہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے وزارت عظمی کے دور میں جناب یاسر عرفات کی آمد پر ہوا تھا۔

اسلامی سربراہ کانفرنس

تعلقات کی ان کوششوں کا آخری کارنامہ ۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہ کانفرنس کی صورت میں لاہور میں وقوع پذیر ہوا۔ جو حقیقتاً مسلم امہ کا ایک عظیم الشان اجتماع تھا۔ ۴۳ ملکوں اور حکومتوں کے سربراہاں نے اس میں شرکت کی۔ اسلامی تاریخ میں کوئی بھی اجتماع اس شاندار اجتماع کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ موقع پی ایل او کو قومی حیثیت دینے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ اور جناب یاسر عرفات کو وہ پروٹوکول دیئے گئے جو کسی ملک کے سربراہ کو دیئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح پی ایل او کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ اور مسٹر بھٹو کی کوشش بار آور ہوئی۔

www.bhutto.org

بڑی ذہانت اور خوش اسلوبی سے سربراہ کانفرنس کا انعقاد مسٹر بھٹو کے وسیع تعلیمی تجربے، تدبر اور عالمی سیاست پر مکمل دسترس کا مظہر تھا۔ دیگر عالمی رہنماؤں کے مقابلے میں ان کی نوجوان، ولولہ انگیز اور جرأت مند قیادت اور سب سے بڑھ کر ان کے انداز خطابت نے ان کو ان راہنماؤں پر فوقیت عطا کی تھی۔ ان کی عالمی قیادت کی صلاحیت ابتدائی مرحلہ سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ تاریخ سے گہرا لگاؤ رکھنے کی وجہ سے ان کو اگر تیسری دنیا کے لئے نہیں تو کم از کم مسلم امہ کے لئے اپنی حیثیت کا احساس ہوا لہٰذا انہوں نے دونوں یعنی مسلم امہ اور تیسری دنیا کی حمایت شروع کر دی اور اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اصل تقسیم مشرق اور مغربی کے نہیں بلکہ شمال اور جنوب کے درمیان ہے۔ یعنی صنعتی اور غیر صنعتی ممالک۔ یہ نظریہ مغرب والوں کو پسند نہیں آیا۔ لیکن جیسا کہ مسٹر بھٹو نے اندازہ لگایا تھا، دنیا آج شمال اور جنوب سے پہچانی جاتی ہے۔

جوہری توانائی

پاکستان کے پاس کراچی میں ایک معمولی سا جوہری پروگرام "کینپ" (KANUPP) تھا جو کینڈا کے تعاون سے چلایا جا رہا تھا۔ اس کا ایک تجرباتی مرکز "نلور" میں واقع تھا۔ لیکن ۱۹۷۴ء میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد حالات ڈرامائی طور پر بدل گئے۔ اس نے مسٹر بھٹو کو چوکنا کر دیا اور انہوں نے سوچا کہ اگر بھارت کو اس کا جواب نہ دیا گیا تو جنوبی ایشیا میں بھارت کی برتری قائم ہو جائے گی۔ مسٹر بھٹو ایسی صورت حال برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے اور انہوں نے قومی سلامتی اور بھارت کی برتری کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے کارروائی شروع کر دی۔ اس کارنامہ کا سہرا ان کے سر ہے کہ انہوں نے اس تکنیک اور طریقہ کار کے انتخاب کے سلسلے میں سی آئی اے کو چکما دے کر فرانس سے ایٹمی پلانٹ مہیا کرنے کی یقین دہانی حاصل کر لی۔ امریکیوں نے فرانس پر دباؤ ڈالا اور اس کو اپنے وعدے سے منحرف ہو جانے پر رضامند کر لیا۔ اور متعدد فورموں کے احتجاج کے باوجود امریکہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر کار مسٹر کیسنجر کے ذریعے امریکہ نے مسٹر بھٹو کو دھمکی دی کہ اگر وہ باز نہ آئے تو ان کو خوفناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا کیونکہ وہ سب کچھ تاریخ میں محفوظ ہے اور قوم کو معلوم ہو جائے گا اور ساتھ ہی وہ معاہدہ جو موجودہ آئی جے آئی کی حکومت کے ساتھ ہوا ہے۔

www.bhutto.org

اندرونی حالات

قبائلی علاقے..... مسٹر بھٹو! قومی یکجہتی کے بانی

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قائداعظم نے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اپنی فہم و فراست سے قبائلی علاقوں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی چھاؤنیوں سے فوجیں ہٹالیں۔ جس کا مقصد خیر سگالی کا اظہار تھا اور یہ یکجہتی کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ چھاؤنیاں برطانوی شاہی دور کی یادگار تھیں۔ اس کے بعد آنے والی حکومتوں نے بھی قبائل کو ان کے اپنے طریقہ کار زندگی کے مطابق رہنے کے لئے چھوڑ دیا اور ان علاقوں کے لئے برائے نام منصوبے تیار کئے اور اس طرح تقریباً پچیس سال کے طویل عرصے تک قبائلی علاقے جن کا رقبہ تقریباً ۱۰۵۰۰ مربع میل تھا اور آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ تھی، سماجی زندگی سے الگ تھلگ سمجھے جاتے تھے اور ان پر پختونستان کا ہوّا سوار تھا۔

۱۹۷۲ء میں مسٹر بھٹو نے صدر کی حیثیت میں قبائلی علاقوں کا دورہ کیا۔ راقم الحروف چند دن قبل ہی بطور انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور وہاں پہنچا تھا۔ مسٹر بھٹو نے تاریخ کی بصیرت رکھنے والے کی طرح اور جغرافیائی اور سیاسی ذمہ داریوں کی غیر معمولی سمجھ رکھنے کی وجہ سے اس علاقے میں ہماری کوتاہیوں کی بھی تعریف کی اور ساتھ ہی انہوں نے ایک عظیم ترقیاتی پروگرام کا منصوبہ بنایا۔ وہ علاقے جو اس سے قبل بالکل الگ تھلگ سمجھے جاتے تھے آہستہ آہستہ ترقی کے دھارے کے ساتھ بہنے لگے۔

شہید چیئرمین اس امر سے اچھی طرح واقف تھے کہ اقتصادی حقائق قومی ترقی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کی واضح مثال مشرقی پاکستان تھی جہاں اسلام آباد کی اقتصادی حکمت عملی وفاقی لحاظ سے بنگالی مسلمانوں کو قبول نہیں تھی۔ ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں چھ ایجنسیوں کا ترقیاتی بجٹ صرف چوالیس لاکھ تھا جو ترقی کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور ۷۷ ۱۹ء میں وہ ایک خطیر رقم یعنی تیس کروڑ تک پہنچ گیا۔ مزید یہ کہ ہر قبائلی سے رابطہ قائم کیا گیا اور جرگہ نے ایک عوامی اجلاس کی جگہ لے لی اور وہ سال میں کم از کم دو مرتبہ ہر ایجنسی کا دورہ کرتے تھے۔ سیاسی ماحول اور انتظامیہ میں تبدیلی کے باعث بہتر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

۱۹۷۷ء میں فیصلہ کیا گیا کہ قبائل کو بھی بالغ حق رائے دہی دے کر صوبائی اسمبلی میں ان کو نمائندگی دی جائے جو ۱۹۷۲ء کے واقعات کے بعد سے ایک دیرینہ مطالبہ چلا آ رہا تھا۔ لیکن

www.bhutto.org

مارشل لاء کی حکومت کے دوران اس کی بزدلی کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا اور آج تک اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوئے۔

ان علاقوں کی شمولیت کے لئے جولائی ۱۹۷۳ء بہترین موقع تھا جب سردار داؤد نے افغانستان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور جس کی وجہ سے علاقے میں طاقت کا توازن بگڑ گیا تھا جس کے نتیجے میں تمام علاقے کو شامل کرنے پر غور شروع کر دیا گیا۔ جس کے خاص خدوخال یہ تھے:۔

اول:۔ افغانستان میں مورثی روایات کا تسلسل اور طاقت ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے بعد داؤد کے ساتھ غیر معروف لوگ اقتدار میں آئیں گے اور پاکستان کے لئے مسائل پیدا کریں گے۔ اس کے علاوہ دور اندیش سیاست دان ہونے کی وجہ سے انہوں (مسٹر بھٹو) نے افغانستان میں طاقت کے خلا کو محسوس کر لیا تھا اور ان کی دور اندیشی نے اس خطرے کا اندازہ لگا لیا تھا جو اس حقیقت سے پیدا ہو گیا تھا کہ اگر بڑی طاقتوں کے نزدیک کوئی خلا پیدا ہو گیا تو وہ اسے پُر کر دیں گی۔ یہ ناگزیر تھا کیونکہ یہ اقتدار کی سیاست کا وطیرہ رہا ہے جس کا ثبوت پانچ سال بعد رونما ہونے والے واقعات سے مل گیا (۱۹۷۸ء اور اس کے بعد کی متعدد بغاوتیں اور آخر کار ۱۹۷۹ء میں افغانستان پر روس کی چڑھائی

دوئم:۔روس اور چین میں نسلی دور کے قائدین کی تبدیلی سامنے تھی۔ اور اس کے پیروکاروں کے سامنے آنے اور غیر معروف قیادت کے نتیجے میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ پلاٹو کے زمانے ہی سے کچھ حالات شناس لوگ (مسٹر بھٹو اس کے ماہر تھے۔) اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی نسلیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں اور حقیقتاً ایک نئی نسل کا اقتدار میں آنا ایک نئے سیاسی دور کی ابتدا ہوتی ہے جس کو میخائل گورباچوف نے متعارف کرایا۔

سوئم:۔شاہ ایران کی وفات کے ساتھ ہی ایران کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ جس کی وجہ سے علاقے کے تمام ممالک کے خدشات بڑھنے کا امکان تھا۔ یقیناً امام خمینی کے اسلامی انقلاب کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چہارم: سب سے اہم یہ کہ مستقبل میں گٹھ جوڑ. باہمی دلچسپیاں روس بھارت اور روس افغانستان معاہدے اور ان کے مقاصد بھی عیاں تھے۔

یہ تمام واقعات انفرادی یا اجتماعی طور پر یقیناً پاکستان کے مستقبل پر اثر انداز ہونے تھے اور قبائلی علاقے اس کا شکار ہوتے۔

www.bhutto.org

افغان جہاد ــــ اور اس کے محرّک

اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلا ملک جس کا مسٹر بھٹو نے دورہ کیا۔ افغانستان تھا۔ جس کے بعد انہوں نے اپنی خارجہ حکمت عملی کا رخ دو طرفہ تعلقات کی طرف موڑ دیا۔ داؤد حکومت کو فوری طور پر تسلیم کر لیا گیا اور اس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش شروع کر دی گئی۔

۱۹۷۳ء میں افغان باشندوں کا ایک وفد یہاں پہنچا جو گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، حبیب الرحمٰن (شہید)، احمد شاہ مسعود، نور محمد محمدی اور دیگر بارہ سے پندرہ افراد پر مشتمل تھا اور ان کے قائد برہان الدین ربانی تھے انہوں نے یہاں پناہ حاصل کی اور مدد کی درخواست کی اور اسی طرح داؤد نے بھی۔ حکومت کی حکمت عملی میں یہ ایک ضرورت اور دانش مندی ہوتی ہے کہ مختلف معاملات اور چیلنجوں سے مقابلے کے لئے مختلف حل موجود ہوں۔ آگے چل کر افغانستان میں ایک تربت یافتہ فوجی افراد کا مرکز موجود میں آیا۔ یہ بات لوگوں کو یاد ہو گی کہ ۱۹۷۴ء میں صوبہ سرحد اور دیگر علاقوں میں کئی بم دھماکے ہوئے اور اس میں ۱۹۷۵ء میں حیات محمد خاں شیر پاؤ کا قتل بھی شامل ہے۔ اس نفرت انگیز جرم کے بعد بھی بم دھماکے مسلسل ہوتے رہے اور آخر کار اس کا جواب دینا ضرور ہو گیا۔ جو پنج شیر میں کارروائی کی شکل میں دیا گیا۔

مسٹر بھٹو کا عظیم سماجی اور اقتصادی پروگرام بھی متاثر ہو رہا تھا۔ نہ صرف پاکستان کے قبائلی علاقے بلکہ ڈیورینڈ لائن کے ساتھ بسنے والے قبائل بھی پاکستان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پنج شیر کی کارروائی داؤد پر رائیگاں نہیں گئی (مسٹر بھٹو کا یہ تجربہ کہ داؤد ایک بزدل آدمی ہے۔ صحیح ثابت ہوا) وہ فوراً پاکستان پہنچے اور ڈیورینڈ لائن کے معاہدے پر دستخط کئے اور اس کی پابندی بھی شروع کر دی گئی جو مارشل لاء دور میں ختم کر دی گئی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ آنے والے ۱۹۷۷ء کے انتخابات کے لئے قبائلی علاقوں کے لئے بالغ رائے دہی پر عمل در آمد داؤد کی درخواست پر ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا گیا تاکہ ان کے اپنے مسائل میں مدد کی جا سکے۔

مسٹر بھٹو جو یقیناً ایک سیاسی شخصیت تھے. ان مسائل کا سیاسی حل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے افغان مہاجر کی قیادت کی رضامندی سے ان کے نمائندوں کا ایک وفد ترتیب دیا تاکہ وہ روم جا کر سابق شاہ افغانستان ظاہر شاہ سے مل کر ان سے گفت و شنید کرے۔ اور یہ معلوم کر کے کہ کیا وہ افغانستان واپس آنا چاہتے ہیں اور یہ کہ اس کا طریقہ کار کیا ہو گا۔ اس کا سہرا مسٹر بھٹو کے سر ہے کہ اسی طریقہ پر ۱۹۸۹ء میں غور کیا گیا اور آج بھی مسئلہ افغانستان اور وہاں ہونے

www.bhutto.org

والی خانہ جنگی کے خاتمہ کا بہترین قابل عمل منصوبہ سمجھا جاتا ہے۔

وہ اس پر رضامند ہو گئے لیکن افسوس کہ پی این اے کے مظاہروں نے اس میں رکاوٹ پیدا کی۔ اور آخر میں غاصب حکومت نے اس اقدام کی نفی کر دی۔ مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے بھی افغان گروپ کا اتحاد منقطع ہو گیا۔ اور ان کے مالیاتی فنڈ معطل کر دیئے گئے (صرف کم نظری کی وجہ سے) اور وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دوسری طرف یعنی سعودی عرب، لیبیا اور کویت وغیرہ کی طرف رجوع کرنے لگے۔ زیادہ تر اس وقت جب ۱۹۷۸ء میں سردار داؤد کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں غیر امریکی مداخلت نے پاکستان کو حفاظتی خول میں بدل دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ اور اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انتخاب کا صحیح استعمال کیا گیا تھا یا غلط اور اس سے کس کو فائدہ پہنچا۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں اپنے دفاع میں بیان دیتے ہوئے میں نے سمری فوجی عدالت میں کہا تھا کہ برصغیر میں ایک تازہ حملہ ہوا ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ نظریاتی ہے۔ اس لئے زیادہ تشویش ناک ہے۔ اگرچہ روائتی حملہ آور وقتی طور پر موجود نہیں لیکن اس کو آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ صرف قائد عوام ایک ایسے سیاستدان ہیں جو ملک کو نہ صرف اس سیاسی بحران سے نکال سکتے ہیں بلکہ اس کی سلامتی کی ضمانت بھی بن سکتے ہیں۔ اس وقت جیل میں افسوس ناک حالت میں ہیں۔ لیکن یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی جو مارشل لاء کے بھوتوں کی ہوس اقتدار اور ذاتی شان و شوکت کے حصول کی کوشش کے درمیان کھو گئی۔

مسٹر بھٹو ــــ ایک انسان

قیادت انسانی زندگی کی ایک صفت ہوتی ہے۔ اور اس کی شخصیت تمام اوصاف کا مجموعہ ہوتی ہے۔ میرے خیال کے مطابق کسی قائد کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کی شخصیت اور صفات کو جاننا چاہئے۔ ہمیں اس کی نفسیات کا تجربہ کرنا چاہئے اور ان وجوہات کا جائزہ لینا چاہئے جنہوں نے اس کو کسی مقصد کے حصول کے لئے ترغیب دی۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ وہ قائد انقلابی ہو۔ انقلاب زیادہ تر اونچے طبقہ کے لوگ لاتے ہیں۔ اور یہ ان کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ کسی پراسرار اور ذہین شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ انقلابی لوگ ان خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے معاشی تکالیف کا سامنا نہ کیا ہو۔ ان کی محرومیاں معاشی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتی ہیں۔ وہ دراصل لاشعور میں انعام، عزت، سیاست میں شرکت اور شہرت چاہتے ہیں جو ان کی باکمال شخصیت کو سماجی انصاف کے لئے جدوجہد میں مصروف رکھنا چاہتی ہے چاہے اس میں مہم جوئی اور خطرات

www.bhutto.org

موجود ہوں۔

انسانی اقدار

۱۹۷۳ء کا موسم سرما تھا۔ صوبہ سرحد کے دورے کے موقع پر اس وقت کے وزیراعظم اپنے چترال کے دورے کے حصہ کے طور پر مستوج روانہ ہوئے۔ اس دن بے حد سردی تھی۔ اور دن بالکل ویران تھا۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی اور وادی میں ہڈیوں میں داخل ہونے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسم کی شدت کے باوجود تمام آبادی قائد عوام کے استقبال کے لئے باہر نکل آئی تھی۔ سب سے زیادہ جس چیز نے ان کو متاثر کیا وہ وہاں کے لوگوں کی غربت اور بدحالی تھی ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور جوتوں کی جگہ انہوں نے پاؤں پر ٹاٹ لپیٹے ہوئے تھے ۔ وہ واضح طور پر اس کرب ناک منظر سے متاثر ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے اور انہوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے "یہ غربت اور بدحالی ہمارا مقدر کیوں ہے! یہ اللہ کی مرضی تو نہیں ہے۔" اس کے بعد آنے والے موسم گرما میں وہ آغا خان کو اس علاقے کے دورے پر لے گئے اور آغا خان فاؤنڈیشن کے لئے راہ ہموار کی جس کا مقصد وہاں کے لوگوں کی بہبود تھا۔ اس کے علاوہ بھی متعدد ایسی مثالیں ہیں جب وہ دیگر قبائلی علاقوں کے دوروں کے موقع پر اس طرح افسردہ ہو گئے تھے اور یہ دورے بعد میں ان علاقوں میں سماجی اور اقتصادی منصوبوں کی ابتدا بن گئے۔

دلیری

کئی مواقع پر میں ان کی دلیری اور حوصلہ مندی کا گواہ ہوں۔ ۱۹۷۳ء میں حکومت کا دائرہ کار مہمند اور باجور کے نواگاڑ کے علاقے تک بڑھا دیا گیا جو اس سے قبل افغانستان کے زیر اثر تھا اور وہاں ۱۹۳۵ء سے اس وقت تک کسی بھی سرکاری شخصیت کو جانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں جب وہ ان علاقوں کے دورے پر جانے لگے تو خفیہ اداروں نے صوبائی گورنر (محمد اسلم خان خٹک) کو مطلع کیا۔ کہ علاقے کی پہاڑیوں پر ایل ایم جی نصب کی ہوئی ہیں۔ جن کا مقصد وزیراعظم کے ہیلی کوپٹر کو نشانہ بنانا ہے۔ مسٹر بھٹو نے نہ صرف وہاں کا دورہ جاری رکھا بلکہ ایک کھلے جلسہ عام سے خطاب بھی کیا۔ جس سے صوبہ سرحد کے گورنر پریشان ہو گئے۔ اس طرح کا واقعہ وزیرستان کے دورے کے موقع پر ایک مختلف خطرناک صورت حال (نیاز علی کی توپیں) میں دوہرایا گیا۔ یہاں بھی شہید نے خفیہ اداروں کے مشورے کے خلاف ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ ان سب سے زیادہ اہم واقعہ وہ تھا جو نکارو بالائی مہمند میں ۱۹۷۶ء میں پیش آیا۔ یہاں وہ نہ

www.bhutto.org

صرف قبائلی لوگوں کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں لے جائے گئے بلکہ خوشی اور جوش میں آکر وہ نہ صرف اپنی بندوقوں سے ہوائی فائرنگ کرتے رہے بلکہ انہوں نے مقامی طور پر بنی ہوئی توپیں بھی داغنا شروع کر دیں۔

حرف آخر

وہ انقلابی پارٹی جس کے وہ بانی تھے موجود ہے اور ایک مقام رکھتی ہے کیونکہ وہ کسی مصنوعی تولیدی عمل سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ ہی پیوند کاری سے بلکہ معاشرے کے حالات کے ردعمل کی پیداوار ہے۔ اس کو عوام نے جنم دیا ہے یہ ہمیشہ قائم اور زندہ رہے گی۔ اپنی مادی یا اقتصادی طاقت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی اخلاقی طاقت اور مفلوک الحال عوام میں تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے۔ وہ انقلاب جس کی ابتداء شہید نے کی تھی آگے بڑھے گا یا اگر کبھی زوال پذیر یا مایوسی کا شکار ہوا تو ہر آنے والی انقلابی نسل (آج کل محترمہ بے نظیر بھٹو) پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کیسے بھی حالات ہوں اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔

ان کی پی پی پی پھل پھول رہی ہے اور وقت کے ساتھ مضبوط ہو رہی ہے (ان نوجوانوں کے اندر بھی جنہوں نے شہید کو اس کی قیادت کرتے نہیں دیکھا ہے) کیونکہ محترمہ شہید کے پیغام کو ان تک پہنچا رہی ہیں اور لوگ ان کی بات کو سنتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی خواہشات، آرزوؤں، اور آئندہ امیدوں کے تصورات سے مطابقت رکھتی ہیں۔

مسٹر بھٹو نے تاریخ بنائی نہیں بلکہ لکھی ہے۔ پاکستان کی سیاست میں ایک کبھی نہ مٹنے والا مقام بنا کر موت کے معاملے میں بھی انہوں نے بلند مرتبہ حاصل کیا۔ پاکستان میں جب تک سیاست باقی ہے دو نام یعنی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی جس کے وہ خالق تھے، غریب اور مفلوک الحال عوام کے لئے ایک راہنما ستارے کے طور پر قائم رہیں گے۔ جن کی سیاسی آزادی کے لئے انہوں نے اپنی تمام زندگی وقف کر دی۔ وہ انقلاب جس کی بنیادیں مضبوط ہیں اور جو عوام کی امنگوں کا آئینہ دار ہے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے گا بشرطیکہ ہم جو ان کے جانشین ہیں اس کو ناکام نہ بنا دیں۔

آیئے، ہم اس انقلاب کی شان کو بڑھانے کے لئے تازہ دم ہو کر اپنے آپ کو وقف کر دیں اور عہد کریں کہ ہم اپنی جان کی قیمت پر بھی اس کے لئے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ یہی عہد ہی اس عظیم راہنما اور پارٹی کے بانی کو اس کے شایانِ شان خراج عقیدت ہو گا۔ جس کی نذر یہ کتاب ہے۔

www.bhutto.org

بھٹو بطور مُصلح

شیخ محمد رشید

پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ۱۹۶۷ء میں ۳۰ نومبر اور یکم دسمبر کو ہونے والے ابتدائی اجلاس میں رکھی گئی تھی جو ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو (شہید) کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا اور مجھے اس میں شرکت کا فخر حاصل ہوا تھا۔

اپنی تاریخی افتتاحیہ تقریر میں اس نئی پارٹی کے قیام کا مقصد بیان کرتے ہوئے قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو نے ان مصائب کو تفصیل سے بیان کیا جن کا عوام موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کی وجہ سے شکار تھے اور یہ کہ کس طرح اس صورت حال سے جو ان مصائب کی جڑ تھے نجات حاصل کی جائے۔ اس مقصد کے لئے جیسا کہ ان کا خیال تھا یہ ضروری تھا کہ اس وقت کی حزب اختلاف کی پارٹیوں کو متحد کیا جائے اور نئی پارٹی ان کے موجودہ متضاد مفادات کے درمیان ایک پُل کا کام کرے۔ اور ان کے تاریخی اختلافات کے لئے مفاہمت کا ذریعہ بنے۔ شہید کا خیال تھا کہ اس ٹھہراؤ کا اصل سبب اس حقیقت میں مضمر تھا کہ بنیادی مسائل کے حل کے سلسلے میں کبھی بھی عوام سے رجوع نہیں کیا گیا۔ انہوں نے ان ناقابل برداشت بدعنوانیوں کے پھیلنے کا بھی ذکر کیا جو اقتصادی نقصان پہنچانے کے علاوہ قوم کی اخلاقی قدروں کو بھی گھن کی طرح چاٹ رہی تھیں۔ چیئرمین بھٹو نے نج کاری پر بھی سخت تنقید کی جس کے تحت انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن جیسے ادارے

www.bhutto.org

کے دو شعبے نجی لوگوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ شہید نے اپنی پارٹی کی اقتصادی حکمتِ عملی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سماجی انصاف حاصل کرنا صرف اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب پیداوار کے ذرائع عوام کے استحصال کا ذریعہ نہ بنیں اور اس سلسلے میں انہوں نے پرزور طور پر اظہار کیا کہ خصوصی اہمیت کی صنعتیں قومیائی جانی چاہئیں۔اور قومی ملکیت میں بنکاری۔ بیمہ کمپنیاں، ذرائع آمدو رفت، برقی قوت کی پیداوار، ذرائع ایندھن اور ملک میں معدنیات کی تلاش ہونا چاہئے۔ سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے شہید چیئرمین نے کہا "بنیادی حقوق کی بحال کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت ہے" روایات کے سوال پر رخ موڑتے ہوئے چیئرمین بھٹو نے کہا "ہم روایات کا احترام کرتے ہیں لیکن بُری اور دقیانوسی روایات کی مخالفت کریں گے۔ ہم ان تمام روایات کا احترام کرتے ہیں جو عوام کی بھلائی کے لئے ہوں نہ کہ وہ سب جو ملک کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہوں۔ ہم اپنے ملک کو ایک نیا تصور اور پاکستان کو ایک انقلابی شکل دیں گے" چیئرمین نے مسئلہ کشمیر کے متعلق کہا کہ اس کا حل رائے شماری ہے۔ جس کا دونوں ملکوں نے اقوام متحدہ میں وعدہ کیا ہے۔ کشمیر کی صورت حال کو انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا "جموں اور کشمیر کے لوگوں کا مستقبل پاکستان کے لوگوں کے مستقبل کا حصہ ہے۔ پاکستان کشمیر کے بغیر ایسا ہی نامکمل ہے جیسے سر کے بغیر جسم"۔

ویٹ نام کے بہادر لوگوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے شہید نے ویٹ نام پر بمباری کی مذمت کی۔ شہید کا خیال تھا کہ ویٹ نام پورے ایشیا کے لوگوں کے لئے لڑ رہا ہے اور یہ ان کا فرض ہے کہ اس کی بھرپور مدد کریں۔ چیئرمین نے حکومت کی ان ہدایات کو "شرمناک" قرار دیا جو پریس کو جاری کی گئی تھیں کہ ویٹ نام پر ڈھائے جانے والے مظالم کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ ہدایات امریکی سفیر کے احتجاج پر جاری کی گئی تھیں۔ چیئرمین نے اپنے خطاب کا اختتام اس دعوے کے ساتھ کیا "صرف ایک سوشلسٹ نظام ہی سب کے لئے مساوی مواقع فراہم کر سکتا ہے اور ایک غیر طبقاتی معاشرے کو جنم دے سکتا ہے۔ جیسا کہ اسلامی عقیدے میں بھی پیش کیا گیا ہے" چیئرمین بھٹو کے اٹھائے گئے نکات اور ان پر پیش کی گئی مختلف دستاویزات اور قرار دادوں پر سیر حاصل تبادلہ خیال کے بعد پارٹی کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا جس کی خاص خاص باتیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

امور خارجہ

○ .....کنونشن نے سیٹو اور سینٹو سے علیحدگی، امریکہ سے باہمی دفاع کے معاہدے کو کالعدم قرار دینے اور پشاور کے قریب اڈہ بند کرنے کا مطالبہ کیا۔

www.bhutto.org

○ .....کنونشن نے اسرائیل کی جارحانہ حکمت عملی اور ان علاقوں پر آباد کاری جو اس نے عرب علاقوں پر عیارانہ حملہ کر کے اپنے قبضہ میں لئے۔ خالی کرنے کا مطالبہ کیا۔

○ .....کنونشن نے اعلان کیا کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی حل ممکن نہیں۔ ماسوائے حق خود ارادی جیسا کہ پاکستان اور بھارت اور اقوام متحدہ نے قبول کیا ہے۔ لہٰذا کنونشن نے مطالبہ کیا کہ حکومت مسئلہ کشمیر کو بھارت کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات کی بنیاد بنائے اور حق خود ارادی کے علاوہ ہر قسم کے حل کو قبول کرنے سے انکار کرے۔

○ .....کنونشن نے ویٹ نام کے لوگوں کی بے مثال بہادری پر ان کو خراج تحسین پیش کیا جو دو دہائیوں سے دنیا کی مضبوط ترین فوجی طاقت کے خلاف جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں۔ شمالی ویٹ نام پر بمباری کو غیر مشروط طور پر بند کرنے کا مطالبہ کیا جو اقوام متحدہ کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی جارہی تھی۔

○ .....کنونشن نے اعلان کیا کہ پاکستان حق خود ارادیت اور دوسری اقوام کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کے جڑواں اصولوں کی خارجہ حکمت عملی کو برقرار رکھے۔

○ .....کنونشن میں خاص طور پر تیسری دنیا کے اتحاد کا ذکر کیا گیا اور مطالبہ کیا کہ ان کی حمایت کی جانی چاہئے کیونکہ پاکستان کا تعلق ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ جیسے ممالک سے ہے۔ جو سیاسی طور پر تو سامراجی طاقتوں کے غلبے سے آزاد ہیں لیکن داخلی معاملات میں ان کی مداخلت کی وجہ سے ان طاقتوں کی نو آبادیاں بنی ہوئی ہیں اور صرف ان کے باہمی اتحاد کا برقرار رکھنا ہی ان کے حقوق کی حفاظت کا ضامن ہو سکتا ہے۔

قومی دفاع

جارحیت کے مسلسل خطرات کے پیش نظر کنونشن نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی عسکری طاقت میں اضافہ کرے۔ اس کے علاوہ قومی ملیشیا تیار کرے اور عوام کو فوجی تربیت دے۔

شہری آزادی

کنونشن نے سیاسی قیدیوں اور پابند شدہ لوگوں کی فوری رہائی، قانون دفاع پاکستان کے خاتمے، ۱۹۶۳ء کے ضابطہ فوجداری کی ترمیم کی دفعہ اور ۱۹۶۴ء کے آزاد جموں اور کشمیر کی دفعات کے خاتمے اور آزادانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔

www.bhutto.org

کنونشن نے پریس کی آزادی اور اس غیر جمہوری قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جس نے اس کی آزادی سلب کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ پریس ٹرسٹ کی تحلیل کا بھی مطالبہ کیا۔

کنونشن نے ان غمزدہ خاندانوں کو جو سیاسی وجوہ پر تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ مناسب معاوضہ دینے کا مطالبہ کیا۔

کنونشن نے تعلیمی آزادی، یونیورسٹی آرڈیننس اور ایسے تمام قوانین جو طلباء اور عملے کی آزادی پر پابندی لگاتے ہوں ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔

اقلیت

کنونشن نے اعلان کیا کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اس اصول کے مطابق کی جائے گی کہ تمام شہری ہر لحاظ سے برابر ہیں۔

سرکاری ملازمین

کونشن نے سختی سے حکومت کی طرف سے سرکاری ملازمین کی خدمات سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی مذمت کی اور اعلان کیا کہ تمام سرکاری ملازمین کی مدت ملازمت کی آئینی طور پر حفاظت کی جائے گی۔

بدعنوانیاں

کنونشن نے انتظامیہ میں خوفناک حد تک چاروں طرف پھیلی ہوئی بدعنوانیوں، رشوت ستانی اور اقربا پروری کا سختی سے نوٹس لیا اور افسوس کا اظہار کیا کہ حکومت اس لعنت سے نجات دلانے میں ناکام رہی ہے۔

اقتصادی مسئلے

دستاویز نمبر ۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ "اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو پارٹی کا مقصد پاکستان کو ایک سوشلسٹ معاشرے میں تبدیل کرنا ہے" آگے چل کر دستاویز میں کہا گیا ہے "کم ترقی یافتہ ملکوں کے لئے سوشلزم ہی استحصال سے دفاع کے لئے ہتھیار اور ایسے ذرائع مہیا کرتا ہے جو عوام کی حالت کو جلد سے جلد ترقی دے کر ان کا معاشرتی وجود بلند سطح پر لے آئے۔" آگے چل

www.bhutto.org

کر اعلان میں کہا گیا ہے (دستاویز نمبر۵) "پارٹی نے اپنی حکمت عملی کے لئے دو خاص طور پر اہم راہنما اصول مرتب کئے ہیں:۔

(الف) جمہوریت یعنی غیر طبقاتی معاشرہ اور

(ب) اقتصادی اور معاشرتی انصاف کے لئے سوشلسٹ نظریات کی ترویج۔

ذرائع پیداوار کے سلسلے میں سوشلسٹ حکمت عملی کا دوبارہ ذکر کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا کہ "عوام کا اقتصادی استحصال اس وقت ممکن ہوتا ہے جب ذرائع پیداوار ایسے لوگوں کی ملکیت ہو جو خود پیدا نہیں کرتے۔ زراعت کے حوالے سے دیہی علاقوں میں ایک کسان کو جاگیردارانہ نظام کے تحت نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس طریقہ کار کے ذریعہ اس کا استحصال کیا جاتا ہے جو پیداوار کو منڈی یا صارف تک پہنچانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔" لیکن صنعتی شعبہ میں جو اصولی طور پر شہری ہوتا ہے وہاں سرمایہ دار استحصال کا ایک مخصوص طریقہ استعمال کرتا ہے۔ صنعت چونکہ ترقی کا پہیہ ہوتی ہے لہٰذا اس کے ڈھانچے میں جلد از جلد اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ عام اقتصادی حالات کی اصلاح ہو سکے اور کم ترقی یافتگی سے چھٹکارہ حاصل ہو۔

یہ بھی نشان دہی کی گئی کہ سوشلسٹ اصلاحات نافذ کرنے کے لئے عام اصول جن پر عمل کرنا ہو گا یہ ہیں:۔

اولاً یہ کہ پیداواری ذرائع جو صنعتی ترقی کے عوامل ہوتے ہیں یا جن پر دوسری صنعتوں کا انحصار ہوتا ہے ان کو نجی ملکیت میں نہیں دیا جانا چاہئے۔

دوئم یہ کہ وہ تمام ادارے جو قومی معیشت کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں قومی ملکیت میں ہونا چاہئیں۔

سوئم یہ وہ ادارے جو مالیتی لین دین (کرنسی) یعنی بیمہ کاری اور بنک کاری کرتے ہیں ان کو قومی ملکیت میں ہونا چاہئے۔

یہاں یہ بات واضح ہے کہ یہ ایک ملی جلی اقتصادیات ہو گی جس میں نجی شعبہ اپنا کردار ادا کرے گا لیکن اجارہ داری قائم نہیں کر سکے گا اور ان حالات میں ترقی کرے گا جو نجی اداروں کے لئے موزوں ہوں گے یعنی مقابلہ بازی۔ نہ کہ حکومت کی حفاظت میں جیسا کہ اس وقت ہو رہا تھا۔

صنعتی کارکنوں کے حقوق کے بارے میں کنونشن نے مطالبہ کیا کہ تجارتی انجمنوں کا قانون (TRADE UNION ACT) میں رد و بدل کر کے اسے آئی ایل او کے معیار کے مطابق بنایا جائے اور انجمن سازی اور ہڑتال کا حق واضح طور پر تسلیم کیا جائے۔ یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ بچوں

www.bhutto.org

کی محنت کشی بند کی جائے۔

قرار داد نمبرے میں اعلان کیا گیا ہے کہ جاگیردارانہ استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔ اور یہ مقصد سوشلسٹ اصولوں کو رائج کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا عوام کی حالت بہتر نہیں ہو سکے گی۔

دستاویز نمبر۵ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ پارٹی کا مقصد جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہے اور وہ سوشلزم کے اصولوں کے مطابق کسانوں کے مفاد کے لئے مضبوط قدم اٹھائے گی۔

کنونشن نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ احکام جاری کرے کہ آئندہ تمام سرکاری اراضی بے زمین یا گزارے کی حد سے کم زمین کے مالکان کے لئے محفوظ کر کے ان کو تقسیم کر دی جائے گی۔

کنونشن نے مزید سفارش کی کہ وہ کاشت کار جن کے پاس گزارے سے کم ملکیت کی زمین ہے۔ مال گزاری سے مُستثنیٰ قرار دیئے جائیں۔

کنونشن نے حکومت سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ زرعی محنت کشوں کے لئے کم از کم اجرت مقرر کرے جو گزارے کی سطح سے کم نہ ہو اور ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ اوقات کار بھی متعین کرے۔ کنونشن نے مزید سفارش کی کہ حکومت رضا کارانہ طور پر باہمی کاشت کاری کی ہمت افزائی کے لئے مثبت اقدام کرے۔

بھٹو شہید ایک "نئے عالمی نظام" کے شدت سے خواہش مند تھے۔ جو تیسری دنیا کو سامراجیت کے استحصالی شکنجے سے آزادی دلائے۔ جو اس عالمی نظام سے مختلف ہو جس کا تصور "بش" نے دنیا پر اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے پیش کیا ہے۔

وزیراعظم بھٹو نے ۱۹۷۴ء میں منعقدہ اسلامی سربراہ کانفرنس کی صدارت بھی کی اور شرکاء پر زور دیا کہ وہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے مسائل خود حل کریں۔ یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ سامراجیوں نے مارشل لاء نافذ کر کے ان کو ان کے عہدے سے ہٹانے کی سازش کی۔ ایٹمی پلانٹ کا تنازعہ بھی اس کی ایک اضافی وجہ تھی۔ جب انہوں نے امریکہ کے دباؤ کہ وہ فرانس سے ایٹمی پلانٹ کی خریداری کا سودا منسوخ کر دیں کا کوئی اثر نہ لیا۔ تو سامراجی طاقتوں نے اپنی دھمکی مسٹر ہنری کیسنجر کے ذریعہ ان الفاظ میں پہنچائی۔

"اگر آپ نے ہمارا مطالبہ منظور نہ کیا تو ہم آپ کو ایک عبرت ناک مثال بنا دیں گے۔"

بھٹو صاحب نے اپنے اپریل ۱۹۷۱ء کو پارلیمینٹ میں کئے گئے خطاب میں ان کو اپنا "خون

www.bhutto.org

کا پیاسا" کہا۔ اس کے بعد راولپنڈی کے راجہ بازار میں ایک دستاویز دکھاتے ہوئے ان کو "سفید ہاتھی" قرار دیا۔ اندرون ملک بھی ایک فوجی آمر کو جاگیرداروں کی حمایت حاصل تھی جن کی جاگیریں لاکھوں مظلوم عوام کی جدوجہد آزادی کے نتیجے میں ختم ہو رہی تھیں۔

حکومت سنبھالنے کے بعد چیئرمین بھٹو نے جو اس وقت صدر تھے اپنے کنونشن میں بتائے ہوئے لائحہ عمل پر فوری عمل در آمد شروع کر دیا۔ ان کے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلی چوتھائی میں اہم صنعتیں، بنک اور بیمہ کمپنیاں قومیالی گئیں۔ زرعی اصلاحات مکمل طور پر نافذ کی گئیں۔ تعلیمی ادارے قومیائے گئے۔ محنت کشوں کے لئے ترقی یافتہ قوانین متعارف کئے گئے اور ایک مکمل صحت اسکیم تیار کی گئی۔ اس میدان میں ایک انقلابی قانون دواؤں کی قیمت کم کرنے کے لئے تیار کیا گیا جس کا نام "ڈرگ (جینرک نام) کا قانون ۱۹۷۲ء تھا منظور کیا گیا۔ جس کے تحت دوائیں تیار کرنے اور فروخت کرنے والوں کو اپنے مخصوص ناموں سے دوائیں تیار کرنے اور فروخت کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ ان کے کیمیائی (جینرک) ناموں سے دوائیں تیار اور فروخت کریں۔ اس انقلابی اقدام سے دواؤں کی قیمت میں نمایاں طور پر کمی ہو گئی۔ عوامی حکومت کے اس عمل کو پوری دنیا میں سراہا گیا۔ برطانیہ کے میڈیکل کالجوں کے گیارہ مقتدر اساتذہ کی مشاورت اور ادارت میں شائع ہونے والے پندرہ روزہ "ڈرگس اینڈ تھیراپیوٹکس بلیٹن" نے اپنی ۲۱ر جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں ایک مضمون بعنوان "پاکستان نے جینیرک نام رائج کر کے دنیا میں اولیت حاصل کر لی" شائع کیا تھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ سوچنے میں تو یہ بات بہت معمولی نظر آتی تھی کہ صرف ایک قانون نافذ کر کے کہ صرف جینرک (کیمیائی) نام استعمال کئے جائیں، یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کوئی بھی ملک جہاں دواؤں کی آزاد منڈیاں ہوں، یہ معمولی قدم بھی نہ اٹھا سکا تھا۔ کیونکہ اس میں شدید سیاسی اور تجارتی دباؤ کا سامنا تھا۔ اگرچہ حکومت پر بین الاقوامی اداروں کی طرف سے شدید دباؤ ڈالا گیا لیکن اس عظیم قائد پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔ بنیادی معاشی اصلاحات کے نتیجہ میں عوام کی فرسودہ سوچ میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ شہید بھٹو ایک عظیم مصلح تھے۔ وہ حالات کو موجودہ صورت میں نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ پاکستان کو صحیح معنوں میں جمہوری، ترقی یافتہ اور خوشحال بنانے کے لئے انقلابی اصلاحات متعارف کرانا چاہتے تھے۔ ان کی خارجہ حکمت عملی کا مقصد تیسری دنیا کو سامراجی طاقتوں کے استحصال سے آزاد کرانا تھا۔ انہوں نے تیسری دنیا میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور تمام اسلامی خطے کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے، آزادی

www.bhutto.org

اور بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اپنے مسائل خود حل کرنے کے احساس کو جگانے کے لئے انتھک کوشش کی۔

کسی ایک مضمون میں ان کی اصلاحات کے ہر پہلو پر لکھنا بہت مشکل ہے ان زرعی اصلاحات کے حوالہ سے جو چیئرمین اور وزیر اعظم شہید بھٹو کی ولولہ انگیز قیادت میں ہوئیں۔ میں صرف زرعی اصلاحات کی تفصیل بیان کروں گا۔

زرعی اصلاحات

زرعی اصلاحات کے دو پہلو ہوتے ہیں یعنی فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ یا زرعی ڈھانچے میں تبدیلی۔ اقتصادیات کے ماہرین میں اس امر پر کوئی اختلافت نہیں ہے کہ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے سنجیدہ اور پرجوش منصوبوں کے لئے اس کے ڈھانچے میں صحت مند تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں پہلے اسی پہلو پر بات کروں گا۔

دنیا کے کسی بھی خطہ میں کوئی عقل مند شخص اس بات سے اختلافات نہیں کرے گا کہ تمام اصلاحات میں سب سے زیادہ مشکل زرعی اصلاحات کو متعارف کرنا ہوتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل ان کا نفاذ اور عمل در آمد ایسی صورت میں کہ سرمایہ دار صرف شہری اقتصادیات تک محدود ہے لیکن مفصلات میں موروثی جاگیردار اقتصادیات اور سیاست دونوں پر قابض ہیں۔ ان کی زمینیں ان کے لئے بغیر کسی محنت کے کمائی کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کی سیاسی طاقت کا ذریعہ بھی ہیں۔ وہ حکومتیں بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی ادروں میں تو کارکنوں کی انجمنیں سرمایہ دار کو اجتماعی سودے بازی یا ہڑتالوں کے ذریعے اپنے مطالبات منوانے پر مجبور کر سکتی ہیں لیکن وہ بکھرے ہوئے اور غیر منظم مزارع کھیتوں میں کام کرنے والے کسان جن کو اپنے حقوق کا علم تک نہیں ہوتا جاگیرداروں کے تابع اور غلام رعایا کی طرح ہوتے ہیں۔ حقیقتاً یہ جاگیردار اپنے علاقوں کے فرمانروا ہوتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کے باوجود جاگیرداروں کا یہ طبقہ صدیوں سے دنیا کے مختلف حصوں پر حکومت کرتا رہا ہے۔ برصغیر کے مسلم عوام نے پاکستان کے لئے بے مثال قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا لیکن اس کے قیام کے بعد بھی جاگیرداروں کی ایک چھوٹی سی اقلیت منتخب حکومت کی شکل میں یا اس کی حمائتی بن کر ابھی تک ان کا آقا اور قسمت کی مالک بنی ہوئی ہے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں بھی گھس آئے ہیں جو کہ معاشرے میں اشتراکی نظام کا نظریہ رکھتی ہے۔ اور وہ پارٹی اور اس کی حکومت پر مسلسل غلبہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔

www.bhutto.org

۵ر جولائی ۱۹۷۷ء کو جب مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو ۲۲ میں سے ۱۴ وفاقی وزراء، ۴ میں سے ۳ وزراء اعلیٰ جاگیر داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ ۴ میں سے ۳ گورنر سابقہ ریاستوں کے حکمران تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جاگیردارانہ نظام کی جڑیں بہت گہری اور ان کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا جب تک کوئی بامقصد انقلاب رونما نہیں ہوتا اور ان جاگیرداروں کے قلعوں کے اندر جانے والے تمام راستے مسدود نہیں کر دیئے جاتے اور ان کے ذاتی مفادات کو اکھاڑ کر پھینک نہیں دیا جاتا۔ ہر ہر قدم اور چپے چپے پر آخری مورچے تک بے جگری سے جنگ نہیں لڑی جاتی یہاں تک کہ ہم ان اصلاح کاروں کی نام نہاد اصلاحات کو درہم برہم نہ کر دیں کیونکہ اس قدیم طاقت کا دباؤ جو لب دم موروثی جاگیرداری کو حاصل ہے۔ جس میں ان کے ساتھ بڑے بڑے صنعت کار اور اعلیٰ سطح کی افسر شاہی بھی شریک ہے۔ اس کی دہشت کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو زرعی اصلاحات پر عملدر آمد کرانے میں مصروف ہیں۔ اس کی گونج خود حکومت کی مشینری کے اعلیٰ طبقے اور حزب اختلاف کے سیاسی آقاؤں میں بھی سنی گئی۔ وہ سخت مزاحمت جس سے زرعی اصلاحات کے نفاذ کو دو چار ہونا پڑا اس کا مقابلہ ان کے ایک سے زیادہ بنیادی مفادات سے کیا جا سکتا ہے۔ جو ان پر صحیح طریقہ پر عملدر آمد سے حاصل ہو سکتے ہیں ان اصلاحات کے برعکس جو صرف ایک مخصوص شعبہ میں کی جاتی ہیں اور ان کا فائدہ بھی صرف اس شعبے کو پہنچتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات تھی کہ شہید بھٹو نے فوری طور پر زرعی اصلاحات پر توجہ دی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح پاکستان کے عوام زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور زمین سے اپنی روزی کماتے ہیں اور وہ فصلیں پیدا کرتے ہیں ان میں سے صرف ایک ہی جنس قومی پیداوار میں بڑا اضافہ کرتی ہے جو قومی آمدن کا تقریباً ۳۰ فیصد ہے جب کہ دیہی آبادی ملک کا ۷۰ فیصد ہے۔ دوسری طرف دیہی آبادی کا زیادہ حصہ بے زمین ہے یا ان کے پاس چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں ان کے پاس اپنا کام کرنے کے لئے زمین کا سہارا بھی نہیں ہے۔ چند ایک جو زمین کاشت کرتے ہیں وہ کسی بھی وقت بے دخل کئے جانے کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ یہ غیر یقینی اور غیر محفوظ صورت حال پیداوار کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ ان حالات میں انسانی ذرائع کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے، زراعت کو ترقی دی جائے۔ اور روزگار کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ اس پس منظر میں عوامی حکومت نے اقتدار سنبھالنے کے بعد تین ماہ کے اندر ہی انقلابی زرعی اصلاحات پر کام شروع کر دیا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار زرعی ڈھانچے میں قانونی طور پر مؤثر تبدیلیاں کی گئیں۔ زمین جیسے قیمتی ذرائع جو

www.bhutto.org

چند ہاتھوں میں مرکوز ہو گئے تھے اور جو فوری طور پر استعمال بھی نہیں کر سکتے تھے قانونی طور پر ان سے حاصل کئے گئے۔ اس طرح حاصل شدہ زمین بے زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دی گئی۔ یہ دراصل جاگیرداری نظام ختم کرنے کا عہد تھا جو حقیقت میں تبدیل ہو رہا تھا۔

اس طرح کاشت کار کو پہلی مرتبہ زمین کی ملکیت کی مدت کی ضمانت دی گئی کیونکہ اس طرح کاشت کار پوری دلجمعی اور یکایک بے دخل کئے جانے کے خوف کے بغیر اپنا کام کر سکتے تھے۔ ان اصلاحات کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ انفرادی ملکیت کی حد ۵۰۰ ایکڑ نہری اور ۱۰۰۰ ایکڑ بارانی (۳۶۰۰۰ پیداواری یونٹ) جو کہ ایوب خان کی نام نہاد زرعی اصلاحات میں مقرر کی گئی تھیں۔ زرعی اصلاحات کے قانون ۱۹۷۲ء کی دفعہ ۱۱۵ کے تحت گھٹا کر علی الترتیب ۱۵۰ ایکڑ اور ۳۰۰ ایکڑ (۱۲۰۰۰ پیداواری یونٹ) کر دی گئی۔ یہ حد ۱۹۷۷ء کی ایک اور دفعہ کے مطابق مزید کم کر دی گئی یعنی ۱۰۰ ایکڑ نہری اور ۲۰۰ ایکڑ بارانی (۸۰۰۰ پیداواری یونٹ)۔ اس کے بعد بھی عوامی حکومت مزید کمی کرنے والی تھی۔

ایوب خان کے مارشل لاء کے ضابطہ کے تحت جاگیرداروں کو باغات کے لئے مزید ۱۵۰ ایکڑ جس کی پیداواری یونٹ ۱۸۰۰۰ ہو اپنے وارثوں کو تحفے میں دینے یا اپنے زیر کفالت دیگر افراد خاندان کو دینے کی فراخدلانہ مراعات جن کے ذریعہ انفرادی ملکیت بعض صورتوں میں ۸۰۰۰۰ پیداواری یونٹ بن جاتی تھی ختم کر دی گئیں۔

پہلی مرتبہ افسر شاہی کی حاصل کردہ زمینوں کی طرف توجہ دی گئی اور تمام سرکاری ملازمین سے ۱۰۰ ایکڑ کی حد سے اوپر زمینیں واپس لے گئیں جو انہوں نے ۱۹۵۹ء کے بعد سے ملازمت کے اختتام کے دو سال بعد تک حاصل کی تھیں۔ شکار گاہیں اور وقف زمینیں جو اس ضابطہ کے تحت مستثنیٰ قرار دی گئی تھیں دوبارہ اصلاحات کے زمرے میں لے آئی گئیں۔

گھوڑوں کے فارمز کی شکل میں حکومت کے منظور نظر لوگوں میں تقسیم کی ہوئی زمینیں بھی واپس لے لی گئیں۔ نئے قانون کے تحت یہ زمینیں بغیر کسی معاوضے کے حاصل کی گئیں۔

بعض فرض شناس مبصرین نے بجا طور پر کہا تھا کہ ایوب خان کی اصلاحات دراصل دوسری شکل میں زمین کے مالکان سے ان کی پسندیدہ شرائط پر ان کی فالتو زمین کا خریدنا تھیں۔

نئی اصلاحات میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس طرح حاصل شدہ زمین اس پر ہل چلانے والوں کو پورے مالکانہ حقوق اور بغیر کسی سابقہ ذمہ داری کے مفت تقسیم کی جا رہی تھی۔ حکومت جانتی تھی کہ ان اصلاحات کے نفاذ سے قبل زمین کے مالکان تیزی کے ساتھ اپنی زمینیں بڑے پیمانے پر منتقل کر رہے تھے تاکہ ان اصلاحات کو ناکام بنایا جا سکے۔ اس عیارانہ لین دین سے

www.bhutto.org

نمٹنے کے لیے وہ تمام زمینیں جو یکم مارچ ۱۹۶۷ء کے بعد ماسوائے اس زمین کے جو جائز ورثاء کو منتقل کی گئی تھیں کی قانون کے تحت جانچ پڑتال شروع کر دی گئی۔ یہ استثنیٰ جاگیرداروں کو پسند نہیں آیا اور انہوں نے محکمہ مال کے افسران سے گٹھ جوڑ کر کے پرانی تواریخ میں اندراج کرانا شروع کر دیئے۔ خاص طور پر تحفتاً دی جانے والی زمینوں کا کیونکہ اس کے لئے کسی انتقال نامہ کے اندراج کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اور یہ پرانی تواریخ میں اندراج کا محفوظ طریقہ تھا۔ اس قسم کی کارروائی بڑے پیمانے پر کی گئی کیونکہ زبانی طور پر زمین تحفتاً دینا قانوناً جائز تھا۔ دراصل قانون میں یہ ایک بڑا نقص تھا جو شروع سے چلا آ رہا تھا جس نے جاگیرداروں کو ان اصلاحات کی زد سے بچ نکلنے میں مدد کی۔ قانون کے اس نقص نے وفاقی معائنہ ٹیم جس کی تشکیل وفاقی لینڈ کمیشن نے کی تھی بڑی مدد کی۔ کیونکہ اس کے اراکین بھی اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور زیادہ تر "جوں کی توں" کے حامی تھے۔ بغیر کسی تفتیش کے اس شق سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

فیڈرل لینڈ کمیشن نے معائنہ ٹیموں کی رپورٹ پر دوبارہ ۳۲۶۲ جاگیرداروں کے معاملات کی پڑتال شروع کی اور ۲۷۱۲ کا فیصلہ کیا۔

سندھ کے وڈیروں، بلوچستان کے سرداروں، پنجاب کے لغاری، مزاری، ٹوانے قریشی اور سرداروں اور صوبہ سرحد کے خاکوانیوں نے بے ایمانی اور مخفی رکھ کر ۳۰ اپریل ۱۹۷۷ء تک فیڈرل لینڈ کمیشن کے ذریعہ جو زمین حاصل کی اس کا رقبہ ۵۶۷۸۳۵ ایکڑ تھا (ان میں سے تقریباً ۵ لاکھ ایکڑ صرف چیئرمین اور باقی مشترکہ طور پر چھ ممبران نے حاصل کی) یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان معاملات کی تصدیق، صوبائی زرعی اصلاحات کے کمیشن نے بھی کر دی تھی۔ محنت کرنے والے عوام اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے حقوق غصب کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ ان کے اپنے بڑے اور ملک کے لوگ ہیں جو صدیوں سے ان کی محنت کے پھل کھانے کے بعد بھی اپنے لوٹ کے مال میں انہیں شریک کرنے کو تیار نہیں اور اس کو صرف اپنا حق سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد ان پر اپنا قبضہ قائم رکھنا ہے۔ اس طرح وہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے محنت کش لوگوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں کیونکہ اس سے ان کے بیرونی اور اندرونی استحصال میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ دیکھیں کہ ان کے آنسو اصلی ہیں یا مگرمچھ کے۔

یہ ان کی عدم دلچسپی اور خفیہ سودے بازی کا نتیجہ تھا کہ چاروں صوبوں میں زرعی اصلاحات کے جال کے ذریعہ زرعی اصلاحات کے ضابطہ ۱۹۷۲ء کے تحت صرف ۱۱۵۶۳۶۲ ایکڑ

زمین حاصل کی جا سکی لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ وفاقی زرعی کمیشن کے صرف ایک ٹرائبیونل نے صوبائی ٹرائبیونل کے فیصلہ کئے ہوئے معاملات کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اس کے نصف رقبے کی کھوج لگائی۔

صوبہ سرحد کی سابقہ ریاستوں کی طرح پٹ فیڈر کے نہری علاقے میں بھی بلوچستان اور صوبہ سرحد کی حکومتوں کا کردار سابقہ ریاستوں کے حکمرانوں اور سرداروں کے مقابلے میں جائز ہل چلانے والوں کو ان کے جائز حق سے محروم کرنا تھا۔ یہاں بھی وفاقی زرعی کمیشن نے اپنے حاصل شدہ اختیارات کے تحت ان مظلوم محنت کش عوام کے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے مداخلت کی۔ جن کی بھلائی کے لئے زرعی اصلاحات نافذ کی گئی تھیں جس کا مختصر ذکر درج ذیل ہے۔

دراصل صوبائی حکومتیں زرعی اصلاحات کے نفاذ کے سلسلے میں دانستہ طور پر ان اصلاحات کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہی تھیں اور یہ وفاقی حکومت تھی جس نے ان پر عمل در آمد کرایا مجموعی طور پر ۳۳۴۰۳۲۱ ایکڑ رقبہ تقسیم کے لئے حاصل کیا گیا اس میں سے ۱۴۷۷۵۷۳ ایکڑ رقبہ ۱۳۷۰۰۵ مزارعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۰ ہزار خاندان سابقہ ریاستوں دیر، سوات اور چترال میں آباد کئے گئے۔

مزارع کی بے دخلی

زرعی اصلاحات کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس میں مزارع کو باعزت اور محفوظ مقام دیا گیا تھا۔ قانون کے تحت کسی مزارع کی بے دخلی ممنوع قرار دی گئی تھی ماسوائے چند خصوصی وجوہات کے یعنی اگر وہ زمین کا کرایہ ادا نہیں کرتا یا اس کو کاشت کاری کے ناقابل بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بے دخلی کے قانون کو کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں مزارع کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہو۔ بلاجواز تاخیر کو بھی ختم کر دیا گیا۔ حکومت کی ہدایات کے مطابق بے دخلی کی کارروائی کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ کار خاص طور پر مقرر کیا گیا ہے۔

(۱) بے دخلی کے مقدمہ کا فیصلہ ابتدائی عدالت ۶۰ دن کے اندر کرے گی۔

(۲) ابتدائی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل ۱۵ دن کے اندر پیش کی جائے گی۔

(۳) اگر ابتدائی عدالت ۶۰ دن کے اندر فیصلہ نہیں کر پائے تو مقدمہ از خود اعلیٰ عدالت میں چلا جائے گا جو ابتدائی عدالت کے طور پر کارروائی کر کے ۳۰ دن کے اندر اس کا فیصلہ کرے گی۔

www.bhutto.org

(۴) مقدمہ کا تمام ریکارڈ اعلیٰ عدالت کے تحت سماعت کرنے والی عدالت کو پیش کیا جائے گا اور اس کے ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کرنا ہوگی کہ مقدمہ کا فیصلہ مقررہ مدت کے اندر کیوں نہیں کیا جاسکا۔ ذیلی عدالت کا جواب غیر اطمینان بخش ہونے کی صورت میں ابتدائی عدالت کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔

(۵) نظر ثانی کی اجازت صرف مزارع کو ہوگی۔ زمیندار کو نہیں۔

(۶) مزارع کو غیر قانونی طور پر بے دخل کرنے پر اس کی مزارعت کو عدالت کے حکم کے بعد ۳۰ دن کے اندر بحال کر دیا جائے گا۔ (اگر اپیل نہ گئی ہو) اپیل دائر ہونے کی صورت میں اپیل کی سماعت کرنے والی عدالت کے فیصلے کے بعد ۳۰ دن کے اندر مزارعت بحال کر دی جائے گی۔

مزارع کو نئی مراعات

۱۹۷۷ء کی زرعی اصلاحات کے تحت خریف ۱۹۷۲ء کے بعد سے مزارع اور زمیندار کے نئے تعلق کے تحت تمام سرکاری ادائیگیوں کا بوجھ زمیندار پر ڈالا گیا ہے۔

(الف) مالگزاری اور دوسرے محصولات، مقدمات، سرچارج زمین کے واجبات کی ادائیگی زمیندار کو کرنا ہوگی۔

(ب) آبیانہ کی ادائیگی اور بیج کی فراہمی زمیندار یا کوئی اور شخص جو زمین پر قابض ہو کی ذمہ داری ہوگی۔

(ج) کھاد اور کرم کش ادویات جو اس زمین کے لئے درکار ہوں گی، کی قیمت زمیندار اور مزارعہ برابر کی بنیاد پر مل کر ادا کریں گے۔

(د) کوئی بھی زمین کا مالک یا قابض اپنے مزارعہ سے نہ تو جبراً کوئی وصولی کرے گا اور نہ بغیر معاوضہ کے کوئی کام لے گا۔

حق شفع

پہلی بار مزارعہ کو اس زمین کے پہلے خریدنے کا حق دیا گیا جس پر وہ کام کرتا ہے۔ اور اس قانون کے نفاذ کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسے تمام مقدمات کی مکمل سماعت اور فیصلہ سول عدالتوں کے بجائے محکمہ مال کی عدالتیں کریں گی اور اس کی ابتدائی عدالت متعلقہ کلکٹر کی عدالت ہوگی۔

www.bhutto.org

فصل کے حصے کے تعین کا قانون

فصل کے حصے کے سلسلے میں اصلاحات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مزارعہ اس رقم جو صوبائی مزارعت کے قانون کے تحت اس پر واجب ہو کے علاوہ ایک پیسہ بھی زیادہ ادا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس کو زمین اس سے بہتر شرائط پر ملی ہوئی ہو تو ایسی صورت میں وہ ان شرائط کے مطابق کام کرتا رہے گا قطع نظر اس بات کے کہ قانون کیا کہتا ہے۔

زرعی قرضے

زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں حصول قرضہ کی ضرورت پیش آئی لہٰذا عوامی حکومت نے زرعی اصلاحات کے ساتھ ہی چھوٹے کاشت کاروں کو زرعی قرضے دینے کی سہولت بھی فراہم کی اور اس کے لئے وفاقی حکومت نے "قرضہ برائے زرعی مقاصد کا ضابطہ مجریہ، ۱۹۷۳ء" منظور کیا۔ جس کے تحت کاشت کار کو ایک "پاس بک" جاری کی جاتی ہے جس کے اندر اس کی زمین کا رقبہ اور پیداواری یونٹ کے مطابق اس کی قیمت اور دیگر قرضوں کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ پاس بک بنکوں کے لئے قرضوں کے اجراء کے سلسلے میں ایک معتبر دستاویز کا کام کرتی ہے جس کی موجودگی میں قرضے فوراً جاری کر دیئے جاتے ہیں اور کسی قسم کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نقد قرضہ کی ساری رقم مقروض کے بنک کے بچت کھاتہ میں جمع کر دی جاتی ہے اور اگر قرضہ جنس کی شکل میں ہو تو مقروض کی پسند کے ادارے کے نام "سپلائی آرڈر" جاری کر دیا جاتا ہے قرضہ کی وصولی آسان اقساط میں کی جاتی ہے۔ قرضے کی مکمل واپسی پر متعلقہ بنک کا منیجر پاس بک میں اس امر کا اندراج کر دیتا ہے اور افسر مال کو بھی اس کی اطلاع دیتا ہے۔ اس بات کو بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ ۷۰ فیصد قرضہ ان قرض خواہوں کو جاری کیا جائے جن کی زمین گزارہ آمدنی کی حد سے کم ہو۔

یہ بڑے اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ "خوراک اور زراعت کے ادارے (F.A.O) کی بین الاقوامی کانفرنس برائے ایشیا، مشرق بعید اور مشرق قریب جو اگست ۱۹۷۵ء میں منیلا اور اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تیونس میں منعقد ہوئی تھی، ماہرین نے متفقہ طور پر پاکستان میں رائج کردہ "پاس بک" کے طریقہ کار کو چھوٹے کاشت کاروں کے لئے ایک مفید طریقہ کار کے طور پر اپنانے کی سفارش کی۔ قرضہ میں چھوٹے کاشت کاروں کے حصے کے تعین کو بھی بہت سراہا گیا۔

www.bhutto.org

چھوٹے کاشت کاروں کا چونگی اور مال گزاری سے استثنیٰ

چھوٹے کاشت کار ۱۹۳۷ء سے اس مال گزاری کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے جو ان کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ سرکاری کمیٹیوں نے ان کے مطالبات کو منظور کر لیا لیکن ان کو انتظامی وجوہات کی بناء پر نامنظور کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ایک مبہم سی تجویز پیش کی گئی کہ پانچ ایکڑ سے کم ملکیت پر مالیانہ ختم کر دیا جائے لیکن اس سلسلے میں مزید پیش رفت نہیں ہوئی۔ عوامی حکومت نے ۱۲ ایکڑ نہری اور ۲۵ ایکڑ بارانی سے کم زمین رکھنے والے کاشت کاروں کو مالیانے، مقامی، ترقیاتی اور دیگر ٹیکسوں سے مُستثنیٰ قرار دے دیا۔ بعد ازاں جب مال گزاری کے طریقہ کار کو زرعی آمدنی ٹیکس میں تبدیل کیا گیا تو ۲۵ ایکڑ نہری اور ۵۰ ایکڑ بارانی زمین کی ملکیت کو آمدنی ٹیکس سے مُستثنیٰ قرار دیا جانا تھا۔ یہ تجویز ابھی زیر غور تھی کہ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔

اس تجویز سے کاشت کار مختلف اداروں کی کارروائی کے بوجھ سے نجات حاصل کر لیتے بلکہ ان کو ان روائتی ٹیکس وصول کرنے والے اداروں کے شکنجے اور مقدمہ بازی سے نجات مل جاتی۔

بلوچستان میں زرعی اصلاحات

بلوچستان کے اضلاع کچھی اور سبّی کے پٹ فیڈر کے علاقہ کا مسئلہ کافی عرصہ سے حل طلب چلا آ رہا تھا۔ اس کے حل کے لئے عوامی حکومت نے "زرعی اصلاحات (بلوچستان پٹ فیڈر کینال) ضابطہ ۱۹۷۲ء (ایم ایل آر ۱۱۷) کا نفاذ کیا۔ ان اصلاحات کے اثرات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۵۳۶۸۳۱ ایکڑ رقبے کو سرکاری زمین قرار دے دیا گیا اور مزارعوں کو ۱۶ ایکڑ انفرادی اور ۳۲ ایکڑ اجتماعی طور پر تقسیم کر دیا گیا۔ اسی وقت مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا۔

سب سے پہلے تو سرداروں اور بڑے جاگیرداروں نے تمام زمینوں کو جعلی مزارعوں کے نام پر حاصل کر کے اپنا قبضہ جاری رکھا۔ وفاقی زرعی کمیشن کے صدر نے موقع پر جانچ پڑتال کرنے کے بعد ان تمام جعلی نامزدگیوں کو منسوخ کر دیا اور زمین کو جائز مزارعوں کے نام منتقل کرنے کی ہدایات جاری کیں۔ بلوچستان میں سرکاری نظام ختم کر دیا گیا۔ شیشک اور خم کی جبراً وصولی خلاف قانونی قرار دے دی گئی۔

www.bhutto.org

کسانوں کے لئے قومی منشور

۱۸ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو عوامی حکومت نے کسانوں کا قومی منشور جاری کیا۔ حکومت نے بے زمین مزارعوں اور غریب کسانوں کو جن کی ملکیت گزارے کی حد سے کم تھی۔ سرکاری زمین تقسیم کرنے کا دلیرانہ قدم اٹھایا۔ کسانوں کے لئے ایک قومی منشور جاری کیا گیا جس کے ذریعہ مزارعوں یا سرکاری زمین حاصل کرنے والے کاشت کاروں کو حق ملکیت دیا گیا اور اعلان کیا گیا کہ تمام قابل کاشت سرکاری زمین بشمول سندھ کی "کچا" زمینیں ان کے کاشت کاروں میں مالکانہ حقوق کے ساتھ تقسیم کر دی جائیں گی جن کے پاس یا تو زمین ہے ہی نہیں یا گزارے کی حد سے کم ہے۔ اور کسی بھی صورت میں زمین نیلام نہیں کی جائے گی اور نہ ہی بڑے رقبوں کی شکل میں پٹے پر دی جائے گی۔ ایک اندازے کے مطابق سندھ میں "کچا" زمین کے علاوہ ۵۰۲۳۱۶۵ ایکڑ قابل کاشت زمین اس مقصد کے لئے فوری طور پر موجود تھی۔ یہاں بھی صوبائی حکومت نے جس کے سپرد اس زمین کی تقسیم کا کام تھا اپنے مذموم مقاصد کے لئے لیت و لعل سے کام لیا۔ بڑے زمینداروں سے ان "کچا" زمینوں کے ایک بڑے رقبے کو خالی کرنے کو کہا گیا جن پر ان کا غیر قانونی قبضہ تھا۔ یہاں شہید بھٹو کے الفاظ دہرانا ضروری ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتنی شدت سے کاشت کاروں کی فلاح کے خواہش مند تھے۔

"تمام طاقت کسانوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر اور ان کے بچوں پر رحمت نازل فرمائے۔"

مشترکہ کاشت کاری

مشترکہ کاشت کاری کے کھیت دراصل ایک خالصتاً اشتراکی زرعی ادارے ہوتے ہیں۔ جو ذرائع پیداوار اور دیگر ذرائع کو یکجا کر کے پیدا کئے جاتے ہیں اور ترقی دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی کا ملک ہے "پاکستان میں زرعی اصلاحات" جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی تھیں کے مطابق مغربی پاکستان (اب پاکستان) میں ۳۲۶۶۱۳۷ (تقریباً ۳۳ لاکھ) کاشت کار ۵ ایکڑ (۲ ہیکٹر) سے کم زمین کے مالک تھے ۱۹۶۰ء کی زرعی شماریات کی رپورٹ کے مطابق ۲۵ ایکڑ (۱۲ ہیکٹر) سے کم ملکیت رکھنے والے کاشت کار طبقے کا ۹۲ فیصد تھے۔ بعد میں وہ زمین وراثت اور منتقلی کی وجہ سے مزید تقسیم ہو گئی۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۲ء کی زرعی اصلاحات کی وجہ سے اس کے مزید ٹکڑے ہو گئے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہو گا کہ سندھ میں ۶۴ ایکڑ اور

www.bhutto.org

دوسرے صوبوں میں ۵۰ ایکڑ زمین کو منافع بخش ملکیت مقرر کیا گیا ہے یہ ایک ایسی کم از کم اکائی ہے جس پر مشینی کاشت منافع بخش سمجھی جاتی ہے اور اس طرح منافع بخش ملکیت رکھنے والوں کی تعداد دو فیصد ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی پر انفرادی کاشت کاری کے مزید نقصانات بھی تھے۔ عوامی حکومت کی تیار کردہ مشترکہ کاشت کاری کے منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ چھوٹی زمینوں کو یکجا کر کے بڑے بڑے فارموں میں تبدیل کر دیا جائے اور اس طرح بڑے زمینداروں کی اس دلیل کا جواب دیا جا سکے کہ چھوٹے چھوٹے حصے کرنے سے پیداوار میں کمی ہو جاتی ہے۔

اس منصوبے میں بتایا گیا ہے کہ مشترکہ کاشت کاروں کی انجمنیں خود مختار اور جمہوری ادارے ہوں گی جس میں حکومت کی کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوگی۔

سیم اور تھور

سیم اور تھور پاکستان کے لئے ایک دوہری مصیبت ہے جو ہماری بہترین زمین کو تقریباً ایک لاکھ ایکڑ سالانہ کی شرح سے نگل رہی ہے۔ عوامی حکومت نے محسوس کیا کہ جدید زرعی طریقوں کی تیزی سے فراہمی مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے سود مند نہیں ہوگی جب تک کہ سیم تھور کی لعنت پر قابو نہیں پایا جاتا۔ اس احساس کے بعد ۲۱ سال سے پھیلی ہوئی اس وبا کو ختم کرنے کے لئے منصوبہ تیار کیا گیا جس کا تخمینہ ۳۰.۶۵۰ ملین روپے تھے۔ متاثرہ اراضی کی دوبارہ آباد کاری کے اچھے نتائج بر آمد ہو رہے تھے۔

دیر، سوات اور چترال

زرعی اصلاحات کا ذکر نامکمل ہو گا اگر یہ نہ بتایا جائے کہ ان سے سابقہ ریاستوں، دیر، سوات اور چترال کے علاقوں میں کیا کچھ حاصل ہوا۔

صوبہ سرحد کی حکومت نے "زرعی تنازعات کی تحقیق" کا ایک کمیشن قائم کیا جس کا مقصد اس علاقے کے زرعی مسائل خاص طور پر مندرجہ ذیل کی تحقیق تھا۔

(۱) مزارعوں اور ان ریاستوں کے سابقہ حکمرانوں اور ان کے ورثاء کے مابین تنازعات۔

(۲) چھوٹے مالکان جن کو سابقہ حکمرانوں یا ان کے ورثاء نے بے دخل کیا۔

(۳) زمیندار اور مزارع کے مابین تنازعات۔

مزارعوں کی ایک بڑی تعداد کو ان زمینوں پر آباد کیا گیا جو سابقہ حکمرانوں، شہزادوں اور

www.bhutto.org

جاگیرداروں سے حاصل کی گئی تھیں۔ مینشن کی سفارشات پر صوبائی حکومتوں کے فیصلے زیادہ تر سابقہ حکمرانوں کے، حق میں ہوتے تھے چنانچہ وفاقی زرعی کمیشن نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس ناانصافی کے ازالہ کے لئے مداخلت کی جو ان جائز حقداروں کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس طرح تقریباً دو لاکھ ایکڑ زمین جو سابقہ ریاست دیر کے کاشت کاروں کے پاس تھی سابقہ حکمرانوں اور شہزادوں سے لے کر ان کاشت کاروں کو حقوق ملکیت کے ساتھ دے دی گئی جو اس پر ہل چلا رہے تھے۔

سوات کے تقریباً تیس ہزار چھوٹے مالکان کے خاندانوں کو ان کی ان زمینوں پر دوبارہ آباد کیا گیا جہاں سے سابقہ حکمرانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں ان کو بڑی بے رحمی سے بے دخل کیا تھا۔

چترال میں بھی مزارعوں کی ایک بڑی تعداد کو ان زمینوں پر مالکانہ حقوق کے ساتھ آباد کیا گیا جو سابقہ حکمرانوں اور شہزادوں سے حاصل کی گئی تھیں۔

زمینیں کیونکہ پیمائش شدہ نہیں تھیں لہٰذا سابقہ ریاست سوات کے حکمران زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت اپنے استحقاق سے زیادہ زمین پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ وفاقی زرعی کمیشن کی پیمائش کرنے والی جماعت نے شدید سردی کے موسم میں پہاڑی علاقے کی زمینوں کا جائزہ لیا اور ان کی پیمائش کی اور اس زمین کی نشاندہی کی جس کے وہ حقدار تھے۔ اور فاضل زمین لے کر اس کو مستحق مزارعوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

یہ مشکل ترین کام بھی وفاقی حکومت نے انجام دیا حالانکہ اس قانون پر عمل درآمد کرانا صوبائی حکومت کی ذمہ داری تھی۔

زرعی اصلاحات کا کام پوری رفتار سے جاری تھا کہ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری اور مقبول حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

زرعی اصلاحات کے اثرات

زرعی اصلاحات کا مقصد زرعی دولت کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے اور مواقع کے حصول میں عدم مساوات کو ختم کرنا اور ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ زمین کے استعمال کی ترغیب دینا ہے پیداوار یقینی طور پر بڑھے گی کیونکہ نئے مالکان اس زمینوں پر دلجمعی سے کام کریں گے جو ان کو دی گئی ہیں اور جس کا انہوں نے ہمیشہ خواب دیکھا تھا۔ زرعی اصلاحات سے اور بھی کئی سیاسی اور سماجی فوائد پہنچے ہیں کیونکہ اس سے ان میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ وہ بھی ملک کی زمیندار برادری

www.bhutto.org

سے تعلق رکھتے ہیں پاکستان میں زمین کی ملکیت عزت کی علامت ہوتی ہے۔ مالکانہ حقوق کے حصول نے مزارعوں کے اندر عزت نفس اور وقار کا احساس پیدا کیا ہے جو برصغیر کی تاریخ میں اس سے پہلے انہوں نے کبھی جانا بھی نہ تھا۔ ہماری نئی نسل مطمئن ہے اور محنتی کاشت کاروں کا وجود عمل میں آ رہا ہے۔ وہ مزارع جو زمین کے مالک نہ بن سکے ان میں بھی مزارعت کی مدت محفوظ ہونے کی وجہ سے آزادی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ جس نے ان کو عملاً اپنے رقبہ کا مالک بنا دیا ہے۔ دیہاتی زندگی پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اب وہ اپنے ان خوش قسمت بھائیوں کی مثال دیتے ہیں جو ان اصلاحات کے نتیجے میں زمین کے مالک بن گئے ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ سیاسی معیشت اور سماجی آزادی کے پھل کا مزا چکھا اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر سیاسی شعور پیدا ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

انقلابی زرعی اصلاحات ایک نئے پاکستان کو جنم دے رہی تھیں وہ پاکستان جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا۔ جاگیرداری استحصال سے آزادی کے ایک نئے دور کا سورج طلوع ہونے والا تھا کہ مارشل لاء کے نفاذ نے اس پیش رفت کو روک دیا۔

زرعی اصلاحات پر عمل درآمد

جس طریقے پر زرعی اصلاحات کو متعارف کرایا گیا اور ان کے نفاذ کی کوششیں کی گئیں اس سے عوامی حکومت کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ دیہی پیداواری طاقت کو جاگیرداری کے ظالمانہ اور استحصالی نظام کے شکنجہ سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ اس مسئلہ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان اصلاحات پر پوری دلجمعی اور جذبے سے عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ اور اس کا پورا فائدہ کھیت میں ہل چلانے والے کو نہ پہنچ سکا۔ اگر ان پر سنجیدگی اور صحیح جذبے سے عمل درآمد کرایا جاتا تو دیہی آبادی میں جاگیردارانہ نظام پر آخری ضرب لگانے کی ہمت پیدا ہو جاتی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ صوبائی حکومتیں جو ان اصلاحات پر عملدرآمد کرانے کی ذمہ دار تھیں۔ ان پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا۔ عوامی حکومت کے پورے دور میں وزراء اعلیٰ اور گورنر یا تو بڑے جاگیردار یا سابقہ نواب تھے۔ اور یہ ایسا ہی تھا کہ چوریاں روکنے کا کام چوروں کے گروہ کے سپرد کر دیا جائے۔ وزراء اور قانون سازوں کی خاصی تعداد ان اصلاحات کی مکمل خلاف ورزی کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی فاضل اور چھپائی ہوئی زمین جس کا سراغ وفاقی زرعی کمیشن نے اپنے خصوصی اختیارات کے ذریعہ لگایا تھا حکومت کے حوالے نہیں کی۔ زرعی اصلاحات کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر سات سال قید بامشقت اور مجرم کی جائیداد ضبط کرنے کی سزا مقرر تھی۔ اور اگر نیت صاف ہوتی تو اس

www.bhutto.org

سزا کی موجودگی میں عملدر آمد کرانا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے کہ اس کے کرتا دھرتا خود ہی اس کے مجرم تھے ایسی صورت حال میں دوسرے مجرموں کو کیسے پکڑا جا سکتا تھا۔

فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے اقدامات

پاکستان بارہ کروڑ آبادی کا ملک ہے۔ جس کی بڑی اکثریت دیہات میں رہتی ہے۔ انکا پیشہ صرف زراعت یا اس سے متعلقہ کاروبار ہے۔ بیشتر مقامات پر ہماری زمینیں بہت اچھی ہیں اور بڑے علاقے پر آبپاشی بھی ممکن ہے پھر بھی خوردنی اجناس میں خود کفالت آزادی کے بعد کے سارے دور میں ہماری گرفت سے باہر رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء تک ایک بڑی مقدار میں خوردنی اجناس کی درآمد ایک معمول بنی رہی۔ بڑی مقدار میں درآمد کے باوجود بھی گزارے کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔ دراصل ہر سال یہ پریشانی ہوتی تھی کہ کیا ملک کبھی اس مشکل پر قابو پا سکے گا کیونکہ ہم کافی عرصے تک اس مسئلے سے پہلو تہی اور غفلت برتتے رہے۔ سرکاری اور محکمانہ طور پر اس پر کچھ سوچا گیا اور کچھ کام بھی کیا گیا۔ ماضی میں کمیٹیاں پیداوار کی فروخت اور تقسیم کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مصروف رہیں لیکن ۲۵ سال کے دوران ۱۹۷۱ء کے آخر تک خود کفالت کے اس مسئلے پر بہت کم توجہ دی گئی۔ ہر سال اجناس خوردنی اس نرخ پر خریدنے میں جس کی ملکی معیشت مشکل سے متحمل ہو سکتی تھی مشکل سے کمایا ہوا، قیمتی بلکہ نایاب زرمبادلہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ سرکاری طور پر درآمد کردہ بیج کی رعائتی نرخ پر فروخت سے عوام کا پیسہ ضائع ہوتا رہا۔ پیداوار بڑھانے کے بعض بہت ہی آسان طریقے مثلاً تشہیر، آزادانہ خرید و فروخت اور ترغیب نہیں اپنائے گئے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو برائے نام۔ اور اس پر بھی عمل نہیں کیا گیا ایک ایسی جنس پر جس کو ہم اپنے ہی ملک میں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے زرمبادلہ جو ہمارے لئے بہت ضروری تھا ضائع کر کے ہم نے نہ صرف اقتصادی طور پر نقصان اٹھایا بلکہ ہمارے ضروری خوردنی اجناس کی غیر ممالک سے درآمد پر انحصار نے بین الاقوامی طور پر اور اندرون ملک ہمارے سیاسی وقار کو بھی نقصان پہنچایا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے افسر شاہی حکمرانوں نے اپنے بیرونی تخلیق کاروں کی قوم کے گلے کی گرفت کو اس وقت تک پسند کیا جب تک ملک کے اندر ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا اور ان کی جیب پر کوئی اثر نہ پڑا ہو۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر اور ماحول جب عوامی حکومت قائم ہوئی۔ زرعی پیداوار کے مسئلے کو جسے اپنے منشور میں ۱۹۶۷ء میں شامل کیا تھا کے مطابق روٹی، کپڑا اور مکان مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔

www.bhutto.org

یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ ہماری تقریباً ساری معیشت زرعی تھی۔ اور ۷۰ فیصد سے زیادہ آبادی بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر زراعت کے پیشے سے منسلک تھی۔ صنعتی میدان میں جو بھی ترقی ہوئی تھی اس کے باوجود زراعت ہماری قومی آمدنی کا ۳۰ فیصد مہیا کرتی ہے۔ بہرحال روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے نے پیداوار کو سب سے زیادہ اہمیت دی تاکہ ہر شخص کو کافی غذا میسر ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے اس پروگرام میں جو تصور کار فرما تھا۔ اس کی ترجمانی قائد عوام وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے قابل تعریف طریقے پر ان الفاظ میں کی۔

"زراعت میں خود کفالت ہماری کامیابی کی کنجی ہے۔ اگر ہم زراعت میں کامیاب ہو جائیں تو ہم کہیں بھی ناکام نہیں ہو سکتے۔ زراعت میں کامیابی کا مطلب ہے سیم اور تھور کا خاتمہ" پانی کا صحیح اور کفایت سے استعمال، زیادہ سے زیادہ پیداوار، کھاد اور کرم کش ادویات کا مناسب استعمال۔ معیاری بیج کی پیداوار، اچھے منظم طریقہ پر قرضوں کا طریقہ کار، درمیانی لوگوں کے ذریعہ استحصال کا خاتمہ، مربوط ذرائع آمد و رفت، زرعی پیداوار کی اچھی قیمت، فصلوں کی مناسب گردش اور شروع سے لے کر آخر یعنی بوائی سے کٹائی تک اور اس کے بعد تقسیم اور فروخت تک سخت نگرانی۔"

اس فلسفہ کی وضاحت اور اس کے پیچھے یقین محکم کے بیان کے بعد ان رکاوٹوں اور موجودہ زرعی مسائل کے حل کی نشان دہی باقی رہ جاتی ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ جو سرسری نظر سے آسان نظر آتا ہے کئی پیچیدہ مسائل کا مجموعہ ہے۔ سورج کی روشنی کی طرح جو سات رنگوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ان رنگوں کی شعاعوں کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ زرعی ترقی کے لئے متعدد چھوٹے بڑے عوامل اشد ضروری ہیں ان میں چند سخت اخروٹ کی طرح ہیں جن کا توڑنا بہت مشکل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ عوامل جو پیداوار میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں جتنے بڑے ہوں گے اتنا ہی مشکل ان کا حصول ہو گا۔ صرف ایسی حکومت ہی جس میں عوام کی فلاح کے لئے کام کرنے کا کبھی نہ ختم نہ ہونے والا ولولہ ہو۔ ایسی حکومت جس کی سربراہی ایک ایسے راہنما کے پاس ہو جو نہ صرف فوری ترقی کا دل سے خواہش مند ہو بلکہ اہم عوامل کو الگ الگ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور پھر ان کے حل کے لئے ان کی اہمیت کے مطابق قوت فراہم کرنے اور اس پر عمل درآمد کرانے کی مکمل قوت ارادی کے ساتھ قومی معیشت کے تمام مسائل پر گرفت کر سکتا ہو میں اس مضمون میں ان خاص مسائل کی جھلکیاں اور اعداد و شمار پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ کہ کس طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی حکومت صحیح سمت کی طرف رواں دواں ہوئی بلکہ

www.bhutto.org

بہت مختصر عرصے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

زرعی تحقیقاتی ادارہ

عوامی حکومت کی یہ دلی خواہش تھی کہ غذائی خود کفالت کم سے کم وقت میں حاصل کر لی جائے۔ اگرچہ اقتدار میں آتے ہی متعدد سماجی اور اقتصادی اصلاحات کو متعارف کرایا گیا لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ زرعی ترقی ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری توجہ اور مکمل جائزے کی ضرورت ہے تاکہ ان عوامل کا پتہ لگایا جا سکے جن سے پیداوار میں اضافہ ہو اور یہ یقینی بنایا جائے کہ اس اہم شعبہ کی اقتصادیات میں آبادی سے زیادہ کے تناسب سے اضافہ ہو۔ زرعی ترقی ایسے باقاعدہ منصوبے کے تحت کی جائے جو پوری طرح منظم اور مربوط ہو۔ اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۷۵ء میں وزیر خوراک اور زراعت کی سربراہی میں ایک اعلیٰ اختیارات کی زرعی کمیٹی جو زراعت کے ہر پہلو پر غور کر سکے قائم کی گئی۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ۱۹۷۴ء کے اختتام تک وزارت خوراک اور زراعت کا قلمدان میرے پاس تھا۔ اس کمیٹی نے زراعت کے ماہر سائنس دانوں کی مدد اور وزیر اعظم کی راہنمائی میں ایک مفصل رپورٹ تیار کی جس پر ان عوامل کی نشاندہی کی گئی جو زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے ضروری تھے۔ کمیٹی کے پیش کردہ منصوبے میں جو سفارشات کی گئی تھیں ان پر ایک سال سے زیادہ عرصہ تک عمل درآمد ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان اہم عوامل کی جو اس منصوبے میں تجویز کئے گئے تھے اور ان پر عمل درآمد کے پہلے سال یعنی ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۵ء پیداوار میں تاریخ وار اضافہ کی وضاحت کروں۔

خود انحصاری

مجھ سے سوال کیا گیا ہے کہ زرعی تحقیقاتی کمیٹی کا زرعی پیداوار کے مسئلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر حصہ کیا تھا۔ میرا جواب ہے کہ "یہ انکشاف کہ تمام فصلات کا معیاری بیج خود انحصاری کی کنجی ہے"

یہ حل سننے میں بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن تین دہائیوں سے اس سے غفلت اور نظر اندازی نقصان کا باعث بنی رہی۔ یہ بات بار بار نہیں دوہرائی جا سکتی اور نہ اس پر زور دیا جا سکتا ہے کہ وہی زمین، وہی ذرائع آبپاشی اور دوسرے لوازمات اور معیاری بیج سے پیداوار میں دوگنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے متاثر ہو کر حکومت پاکستان نے تمام فصلات کے اعلیٰ اور معیاری

www.bhutto.org

بیج کے حصول اور فراہمی کے لئے کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے بین الاقوامی امداد اور ۵۶۰ ملین روپے کے خرچ سے بیج کی صنعت کا ایک منصوبہ تیار کیا گیا اس منصوبے کو سائنسی خطوط پر کام کرنا تھا اور بیج کے معیار کو برقرار اور اس پر نگرانی رکھنے کے لئے "قوانین تخم" پر عملدر آمد کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے وفاقی سطح پر ایک "قومی بیج کونسل" اور بیج کے معیار کی تصدیق کرنے والا ادارہ قائم کیا گیا۔ بیج پیدا کرنے والے بڑے صوبوں یعنی پنجاب اور سندھ میں "سیڈ کونسلز" اور "سیڈ کارپوریشنز" قائم کی گئیں۔ سیڈ کارپوریشنز کا کام گندم، چاول، مکئی اور کپاس کا بیج پیدا کرنا تھا۔ اسی طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان میں سبزیوں اور آلو کے بیج کے منصوبے شروع ہونا تھے۔ بیج کی صنعت کو ۷۸ - ۱۹۷۷ء میں پوری رفتار سے کام شروع کرنا تھا اور تمام اہم فصلات کا تقریباً ۲۹ ٹن معیاری اور تصدیق شدہ بیج تیار کرنا تھا۔ دریں اثناء ابتدا کے طور پر ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۸.۷ کروڑ کی مالیت کا ۱۷۰۰۰ ٹن گندم کا معیاری بیج در آمد کیا گیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ معیاری بیج جو ۱۹۰ روپے فی من کی شرح سے در آمد کیا گیا تھا، کسانوں کو بہت ہی رعائتی نرخ یعنی ۷۰ روپے فی من کے حساب سے فراہم کیا گیا۔ اور اس طرح حکومت کو ۵۵ کروڑ روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں صرف ۳.۹ لاکھ من بیج کے مقابلہ میں ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں ۳۵ لاکھ من بیج فراہم کیا گیا۔

۷۱ - ۱۹۷۰ء میں کیمیائی کھادوں کا استعمال ۳۸۰۰۰۰ سی میٹرک ٹن سے بڑھ کر ۶۵۰۰۰۰ ایم / ٹن تک پہنچ گیا تھا اور یہ مقدار ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں ۷۰۰۰۰۰ ایم / ٹن ہو جانی تھی۔

کھادوں کے نرخ مناسب طریقہ پر مقرر کئے گئے اور اس کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے ملکی پیداوار کو نئی فیکٹریاں لگا کر اور موجودہ فیکٹریوں میں توسیع کر کے ۱۹۸۰ء تک ۳۱۶۰۰۰ ایم / ٹن سے بڑھا کر ۹۴۰۰۰۰ ایم / ٹی کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔

کرم کش ادویات کی طرح تحفظ نباتات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عوامی حکومت نے تحفظ نباتات کے عوامل کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ اس کی کارکردگی کو منظم بھی کیا۔ دستی اور مشینی دوا پاش صوبائی حکومت کی طرف سے فراہم کئے جا رہے تھے اور ادویات ۵۰ فیصد رعائتی قیمت پر فراہم کی جا رہی تھیں ہوائی جہازوں کے ذریعہ دوا پاشی وفاقی حکومت کے خرچ پر کی گئی۔ ۷۰ - ۱۹۶۹ء میں ۳۰ لاکھ ایکڑ دوا پاشی کا رقبہ ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں بڑھ کر ۸۰.۲۶ لاکھ ایکڑ ہو گیا۔ جو تقریباً ۲۰۰ فیصد اضافہ تھا۔ کرم کش ادویات کو وافر مقدار میں در آمد کر کے ان کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا۔ اس لائحہ عمل کے تحت کپاس، گنا اور چاول کے ہر ایکڑ پر کم سے کم وقت میں ۱۰۰ فیصد دوا پاشی کی گئی۔

www.bhutto.org

مشینی کاشت

پیداوار میں اضافے کے لئے مشینی کاشت کی جو اہمیت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے اور اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ در آمد کردہ ٹریکٹروں کی تعداد ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں ۴۲۰۰ تک ہو گئی جو مزید بڑھ کر ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں ۱۵۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ اسی طرح ٹیوب ویلز کی تعداد جو ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں صرف ۹۷۰۰۰ تھی ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں بڑھ کر ۱۴۵۰۰۰ ہو گئی۔ بارانی، سیلابی اور غیر نہری علاقوں میں ٹیوب ویل لگانے کے لئے حکومت کی طرف سے علی الترتیب ۱۲۰۰۰، ۱۰۰۰۰ اور ۸۰۰۰ روپے کی امداد دی گئی۔

منافع بخش قیمتیں

یہ بات کہنے سے رہ گئی کہ ہم کو کیمیائی کھاد، کرم کش ادویات اور متعلقہ لوازمات کافی مقدار میں مناسب نرخوں پر تیار اور فراہم کرنا ہوتی ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صرف مناسب قیمتوں پر فراہمی پر کہانی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کہانی کا اہم حصہ سطح کے نیچے ہے۔ یہ وہ نمایاں حصہ ہے جو دو پہلوؤں پر غور کرتا ہے ان میں سے ایک پیداوار میں اضافہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی کاشت کار ایسی فصل پیدا نہیں کرے گا۔ جو وہ معقول منافع بخش نرخ پر فروخت نہ کر سکے۔ دوسرا پہلو کسانوں کو کاشت کاری کے جدید طریقوں اور ان کے لوازمات کے استعمال کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا عوامی حکومت نے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے ہر پہلو پر بڑی گہرائی سے غور کیا۔ یہ تھا وہ طریقہ جس کے ذریعہ وہ تمام اطراف سے اس مسئلے پر حملہ آور ہوئے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ گزشتہ حکومتوں نے کاشت کاروں کو پیداوار کے معقول معاوضہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ عوامی حکومت کی پالیسی کا راہنما اصول یہ تھا کہ کاشت کاری کی ضرورت اور شہری صارف کے مفادات میں توازن پیدا کیا جائے۔ اس اصول کے تحت ایک مضبوط منافع بخش قیمتوں کا منصوبہ متعارف کرایا گیا۔ گندم کا نرخ جو ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں ۱۷ روپے فی من تھا ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں بڑھا کر ۳۷ روپے فی من کر دیا گیا۔ باسمتی چاول کا نرخ جو ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں ۳۸ روپے فی من تھا ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں ۹۰ روپے فی من کر دیا گیا۔ گنے کا نرخ جو ۷۲ - ۱۹۷۱ء میں ۲٫۲۵ روپے سے ۲٫۶۵ روپے فی من تک تھا ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں ۵٫۵۰ روپے سے ۵٫۹۰ روپے فی من تک رہا۔ یہاں یہ بات بھی بتا دی جائے کہ منافع بخش قیمتوں کے مقرر کرنے کی وجہ سے جہاں کاشت کار کا مناسب معاوضہ محفوظ ہو گیا وہاں حکومت نے

www.bhutto.org

صارف کے مفادات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ گندم جو حکومت نے ۴۵ روپے فی من کے حساب سے (قیمت خرید ۳۷ روپے فی من جمع ۸ روپے فی من اضافی خرچہ) حاصل کیا تھا صارفین کو ۳۲ روپے فی من کے نرخ پر فروخت کیا گیا۔ جہاں تک چھوٹی اجناس مثلاً مکئی، پیاز اور آلو کا تعلق ہے۔ ان کے نرخ کبھی بھی کسی حکومت نے مقرر نہیں کئے تھے۔ حکومت نے ان اجناس کی قیمتیں مقرر کر کے ان کے کاشت کاروں کو بھی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کی غیر یقینی صورت حال سے بچالیا تھا۔ ان تراغیب کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے یہ ممکن ہو سکا کہ رفتہ رفتہ ان اجناس کی برآمد سے پابندی ہٹالی جائے۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ ملکی صارفین کو یہ مناسب نرخ پر ملتی رہیں گی۔

شعبہ حیوانات/مال مویشی

یہاں مال مویشی کے متعلق مختصر ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا۔ جب تک عوامی حکومت قائم نہ ہوئی یہ بھی ایک شعبہ تھا جو غفلت کا شکار رہا۔ ۱۹۶۰ء تک قومی آمدنی میں مال مویشی کے شعبہ کا حصہ تقریباً ۳۸ فیصد تھا۔ بہرحال گزشتہ حکومتوں کی تنگ نظری کی وجہ سے مال مویشی کا شعبہ نقصان اٹھاتا رہا۔ اس حد تک کہ ایک عام اضافہ ہونے کے بجائے اس اہم شعبہ کی آمدنی کا حصہ ۱۹۷۲ء میں کم ہو کر صرف ۲۸ فیصد رہ گیا۔ اور یہ کام عوامی حکومت کے حصے میں آیا کہ وہ شعبہ حیوانات کا جائز مقام بحال کرے۔ اس مقصد کے لئے متعدد قدم اٹھائے گئے تاکہ اس کی مکمل ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اوپک اور آئی آر بی ڈی کی امداد سے کئی منصوبے تیار کئے گئے۔ یہ ایک بڑی سرمایہ کاری کے منصوبے تھے جو تکمیل کے مراحل میں تھے ان میں خاص طور پر شیخوپورہ کے قریب ۲۰ ملین ڈالر کا مال مویشی کا منصوبہ تھا جو تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے ذریعہ ۵۰۰۰۰ چھوٹے اور بڑے دودھ اور گوشت پیدا کرنے والے افراد کو فائدہ پہنچا تھا۔ ان کی مملوکہ ۷۰۰۰۰ بھینسوں اور ۳۰۰۰۰ دیسی نسل کی گایوں سے بہتر نسل حاصل کی جا رہی تھی۔ اس مقصد کی ابتداء کے لئے منجمد مادہ تولید کی ۶۵۰۰۰ خوراکیں ٹیکے درآمد کئے گئے۔ یہ منصوبہ سالانہ ۴۵۰۰۰ ٹن دودھ اور ۵۵۰۰ ٹن گوشت پیدا کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔

اقتدار سنبھالنے کے بعد حکومت نے جو حکمت عملی اختیار کی اس کے نتیجے میں ۱۹۷۵ء (جولائی تا اکتوبر) کی برآمد ۳۵ کروڑ کی سطح تک پہنچ گئی۔ اگلے ہی سال یعنی ۱۹۷۶ء میں اور بھی زیادہ اضافہ رونما ہوا اور ابتدائی چارہ ماہ میں ۵۷ کروڑ روپے کی مال مویشی برآمد ہوئی۔ اس میں اون، چمڑا، قالین اور مچھلی بھی شامل ہیں۔ اور یہ مجموعی زرعی اشیاء کی برآمد کا ۲۷ فیصد ہے۔

www.bhutto.org

مندرجہ ذیل جدول میں ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک ملک میں مال مویشی کی پیداوار کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۶ء

اقسام	۱۹۷۲ء	۱۹۷۶ء
بھینسیں	۹ء۷ ملین	۱۰ء۳ ملین
بھیڑیں	۱۲ء۸ ملین	۱۶ء۲ ملین
بکریاں	۱۴ء۸ ملین	۱۸ء۸ ملین
پالٹری	۲۳ء۰ ملین	۳۰ء۰ ملین

صرف بار برداری کے جانوروں کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی۔ جو ۱۹۷۲ء کی تعداد ۱۴ء۴ ملین سے کم ہو کر ۱۹۷۶ء میں ۱۳ء۷ ملین رہ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشینوں کے استعمال کی وجہ سے ان کی طلب میں کمی آ گئی تھی۔

خصوصی عوامل

زرعی پیداوار ایک خصوصی عمل ہے۔ یہ صنعتی پیداوار سے یکسر مختلف ہوتی ہے جس کو انسانی کوشش کے مطابق تیز اور لامحدود کیا جا سکتا ہے اس کے برعکس کاشت کاری اور مویشی کی نسل کشی قدرت کے اٹل اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ فصل ہو یا جانور ان کی نوعیت قدرت کے مقرر کردہ ایک گردش کے مطابق ہوتی ہے جو عملاً تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ یہ دونوں عوامل بیماریوں اور کیڑے مکوڑوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں جب کہ صنعتی عوامل میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ قدرت کے عنصری عوامل جیسے موسم، آب و ہوا اور قدرتی ذرائع یعنی زمین اور پانی زرعی پیداوار کی مقدار اور معیار کو متعین کرتے ہیں لیکن صنعتی پیداوار پر ان کا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ زراعت میں محفوظ راستہ غیر محدود نہیں ہے بلکہ حقیقتاً بالکل محدود ہے۔ لہٰذا زراعت میں ترقی کی تمام کوششیں بہت سخت ہوتی ہیں کیونکہ ان میں قدرت کے قوانین سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انسانی تدابیر جو اگر صرف کام کرنے کے جذبے سے استعمال کی جائیں تو حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتی ہیں۔

عوامی حکومت نے جو اقدام کئے جن میں سے چند کا خاکہ میں نے پہلے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ منافع بخشی نتائج کے حامل ہیں۔ جن کو میں ذیل میں دو جدول کے ذریعے بیان کروں گا۔

www.bhutto.org

ایک جدول کا مقصد پیداوار میں وہ تقابل اور فرق بتانا ہے جو پانچ بڑی زرعی اجناس میں ہوا۔ اور جیسا کہ ۷۰ - ۱۹۶۵ء تک کی پانچ سالہ اوسط سالانہ سے ظاہر ہوتا ہے اور عوامی حکومت کے چار سال بعد یعنی ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں۔

اعداد بولتے ہیں

جدول نمبر ۱

فصل	اوسط پیداوار ۷۰ - ۱۹۶۵	اصل پیداوار ۷۶ - ۱۹۷۵	فیصد اضافہ ۷۰ - ۱۹۶۵ء کے اوپر
گندم (ہزار ٹن میں)	۵ء۶۲۶	۸ء۵۰۰	۵۱ فیصد
چاول (ہزار ٹن میں)	۱ء۶۹۵	۲ء۵۷۸	۵۱ فیصد
مکئی (ہزار ٹن میں)	۶۳۲	۷۹۰	۲۵ فیصد
کپاس (ہزار گانٹھوں میں)	۲ء۷۶۵	۲ء۸۹۰	۴ء۴۹ فیصد

آخری خانے میں ظاہر کیا گیا اضافہ کسی بھی لحاظ سے غیر معمولی ہے سوائے کپاس کے جس کی فصل کو شدید بارش اور سیلاب نے ایک نہیں بلکہ دو مرتبہ تباہ کیا اور وہ بھی بوائی اور پھول دینے کے نازک مراحل پر یہ آفات جو تباہی لائیں ان پر قابو پانا انسانی دسترس سے باہر تھا۔

میں یہاں ان ہی پانچ اجناس کا ۷۵ - ۱۹۷۴ء اور ۷۶ - ۱۹۷۵ء کا مختصر تقابل پیش کرنا چاہوں گا جس کے مختصر جائزے سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ صرف ایک سال کی سنجیدہ اور مسلسل کوشش سے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہو سکے ہیں۔ میں جس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ زرعی تحقیقاتی کمیٹی کا تیار کردہ منصوبہ ماہ جون ۱۹۷۵ء کے دوسرے نصف میں منظور ہوا۔ وزارت خوراک اور زراعت نے صوبوں کے تعاون سے اپنی تمام تر صلاحیت اور قوت مندرجہ ذیل نتائج حاصل کرنے پر صرف کر دی۔

جدول نمبر ۲

فصل	پیداوار ۷۵ - ۱۹۷۴ء	پیداوار ۷۶ - ۱۹۷۵ء
چاول (دس لاکھ ٹن میں)	۲ء۲۷۷	۲ء۵۷۶
مکئی (دس لاکھ ٹن میں)	۰ء۷۳۵	۰ء۷۹۰
گنا (دس لاکھ ٹن میں)	۲۰ء۹	۲۵ء۱۶۳
کپاس (دس لاکھ گانٹھوں میں)	۳ء۵۶۷	۲ء۸۹۰

www.bhutto.org

جیسا کہ آخری خانے کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے ہم گندم کے معاملے میں خود کفالت کے نشان تک پہنچ گئے تھے۔ صرف کپاس کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی جس کی وجوہات گزشتہ پیراگراف میں بتادی گئی ہیں۔ دنیا کے کسی خطے میں بھی ایک سال کے عرصے میں زرعی ترقی کی ایسی شاندار مثال نہیں ملتی۔ یہاں یہ بات بھی بتا دی جائے کہ ایک افسوس ناک واقعہ کی وجہ سے اس سال عظیم تربیلا بند سے پانی نہ چھوڑا جا سکا ورنہ پیداوار میں مزید اضافہ ہوتا۔ ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں موصول ہونے والی صوبائی رپورٹوں کے مطابق گندم کی پیداوار خود کفالت کے نشان یعنی ایک سو ملین ٹن تک پہنچ گئی تھی لیکن مارشل لاء نے مرکز میں ان اعداد شمار کو مرتب ہونے سے روک دیا۔

کسان

زمین پر ہل چلانے والا

یہاں ان کسانوں کا ذکر کرنا بے انصافی ہوگی جنہوں نے زرعی اصلاحات سے متاثر ہو کر اور اس جذبے سے جو دیہی آبادی کی فلاح کے متعدد منصوبوں نے انکے اندر پیدا کیا تھا۔ اس مہم میں شامل ہوئے اور سخت محنت کی جس کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ پیداوار میں اضافہ ایک معمولی سی حد سے زیادہ نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان ہل چلانے والے محنتی کسانوں کی شرکت کے بغیر اس کامیابی کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہی کسان ہے جو اس پیداوار کی اکائی ہے۔ یہ ان ہی کے تصورات اور امیدیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ سب کچھ کر دیا گیا جو ہو سکتا تھا لیکن جو کام بھی کیا گیا اس پر عوام اور حکومت کو یقیناً فخر ہونا چاہئے۔ بہرحال ابتدا کر دی گئی ہے ایک ایسی ابتداء جس کے کئی پہلو تھے اور عوامی حکومت کے پاس موجود قلیل عرصہ میں اتنا کچھ کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوامی حکومت کی گہرائی اور سچائی کے بغیر یہ ترقی ایک امید اور خواب بنی رہتی ہم ایک نئے دور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک نیا پاکستان جس کا ہم نے خواب دیکھا تھا قریب آ گیا تھا۔ زراعت میں خود کفالت جو نئے دور کا سب سے اہم حصہ تھی نہ صرف ہمارے سامنے بلکہ گرفت میں تھی۔

www.bhutto.org

غریب کے گھروں کا مکین

غیاث الدین جانباز

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو ان چند منتخب بین الاقوامی قائدین میں سے تھے جو ہر اس شخص کو جو ان سے ملتا تھا اپنی فہم و فراست، انداز، طور طریق اور تخاطب سے اپنا گرویدہ کر لیتے ہیں۔ وہ ایک پرکشش شخصیت کے مالک تھے اور نہایت وجیہہ تھے۔ ان کی آنکھیں سحر انگیز تھیں اور ان کا رکھ رکھاؤ بڑا پروقار تھا۔ اس تمام حسن اور وقار کا اظہار عوام کو ان کی معصومیت، مسکراہٹ اور آنسوؤں میں نظر آتا تھا۔ وہ ملاقات کے لئے آنے والے ہر شخص کا احترام کرتے تھے اور اس کو اپنے ہی برابر سمجھتے تھے۔ وہ معمولی سے معمولی سیاسی کارکن سے بڑی عزت اور شفقت سے ملتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اس کے مسائل میں شریک ہو کر ان کا حل کریں۔ یہ کارکنوں کے ساتھ ان کی محبت اور ان کی فلاح کا وعدہ تھا جس کی وجہ سے ان کی پارٹی آج بھی بہت مقبول ہے اور ملک کے غریب عوام اس کو بالکل اپنی پارٹی سمجھتے ہیں۔

جب انہوں نے ۳۰ر نومبر ۱۹۶۷ء کو پارٹی کا کنونشن طلب کیا تو اس میں تقریباً چھ سو لوگوں نے شرکت کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو بھٹو صاحب نے اپنے مشفقانہ کردار سے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ اپنی سچائی، محبت اور عوام کے ساتھ لگاؤ کی بناء پر عوام نے ان کو "قائد عوام" کا خطاب دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے کروڑوں غریب لوگوں نے ان کی شہادت پر اس طرح

www.bhutto.org

ماتم کیا جیسے ان کا کوئی اپنا بھائی یا باپ وفات پا گیا ہو۔

مجھے یاد ہے کہ جب پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے اخبارات نے ان پر تنقید کی، مسٹر بھٹو نے اپنے چاروں طرف ناتجربہ کار اور ناپختہ لوگوں کو جمع کر لیا ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے ساتھیوں کی سیاسی تربیت کی اور اپنے ساتھ گفتگو کے دوران ان کو سیاسی رموز سے روشناس کرایا۔ وہ ان کے ذہنوں کو جلا بخشتے تھے۔ وہ یہیں نہ رکے بلکہ وہ اپنے ساتھیوں کی کارگزاری پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے اور ان کی غلطیوں کو درگزر کر دیتے تھے۔ اور کسی کو بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس سے ناراض ہیں۔ وہ اپنے ہزاروں کارکنوں کو ان کے نام سے جانتے تھے۔ اگر آپ ان سے صرف ایک بار ملے ہوں تو آپ کا نام ان کے کمپیوٹر جیسے دماغ میں محفوظ ہو جائے گا۔

۱۹۷۰ء میں چیئرمین بھٹو مسٹر مسیح الرحمٰن سے ملنے فیصل آباد کی جیل گئے۔ مسٹر مسیح الرحمٰن مولانا بھاشانی کے دست راست تھے اور بعد میں بنگلہ دیش کے نائب وزیراعظم بھی بنے تھے۔ وہ ملاقات ایک خفیہ ملاقات تھی۔ لیکن ایک چودہ سالہ لڑکے نے جو جیل کے باہر کھڑا تھا۔ کار سے اترتے وقت بھٹو صاحب کو پہچان لیا۔ وہ شہید کے قریب پہنچا اور سلام کرنے اور ہاتھ ملانے کے بعد ان کو بتایا کہ وہ نویں جماعت کا طالب علم ہے۔ جب ایوب خاں نے شہید کو گرفتار کیا تو اس لڑکے نے طلباء کا ایک احتجاجی جلوس نکالا تھا۔ وہ لڑکا بڑا ہو کر ۱۹۷۶ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی ٹوبہ ٹیک سنگھ شاخ کا جنرل سیکریٹری بنا۔

۲۶ر جنوری ۱۹۷۷ء کو جب شہید بھٹو اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچے تو ہیلی پیڈ پر وہ لڑکا بھی استقبالیہ قطار میں کھڑا تھا۔ شہید اس کے قریب آ کر رک گئے اور اس کا چہرہ دیکھتے ہی کہا۔ "اب تم جوان ہو گئے ہو۔ کیا تم وہی طارق سعید نہیں ہو جس سے میں فیصل آباد جیل کے باہر ملا تھا۔" اس کے بعد انہوں نے طارق سعید سے کہا کہ وہ انتخابات کے بعد ان سے ملاقات کرے اور اپنے ملٹری سیکرٹری سے طارق سعید کا نام نوٹ کرنے اور اسلام آباد مدعو کرنے کو کہا۔ "میں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اسے اسلام آباد بلانا چاہتا ہوں کیونکہ اس نے میری جیل سے رہائی کے لئے جلوس نکالا تھا" عوام میں آج تک ان کی محبت کی جائز وجوہات ہیں۔ شہید ان کے چہروں کو اس طرح نام سے جانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو شہید کو جانتے تھے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مظلوم ان کو یاد کرتے ہیں اور پاکستان کے ہر غریب کے گھر میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۲ر اپریل ۱۹۷۰ء کو سانگھڑ میں ان پر قاتلانہ حملے سے دو دن

www.bhutto.org

قبل ہوئی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے جام صادق علی کا ہاتھ تھا۔ لوگ ان سے ملنے آ رہے تھے۔ اس سے قبل ۲۳ر مارچ ۱۹۷۰ء کو میں نے اور میرے ساتھیوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مولانا بھاشانی کی مشہور، کسان کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے شہید کو مشورہ دیا کہ مغربی پاکستان میں بائیں بازو کے مقبول ترین قائد کی حیثیت سے ان کو بائیں بازو کی تمام پارٹیوں کے ساتھ مل کر ایک پلیٹ فارم کے طور پر کام کرنا چاہئے تاکہ ان کے درمیان اختلافات کو دور کیا جا سکے۔

انہوں نے میری باتوں کو بڑے غور سے سنا اور کہا کہ وہ خود بھی بائیں بازو کی پارٹیوں کے اندرونی اختلافات کی وجہ سے پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بایاں بازو کم از کم پروگرام پر ہی متفق ہو جائے لیکن ان کو امید نہ تھی کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ بائیں بازو کی پارٹیوں اور ان کے قائدین کا نکتہ نظر اس قدر جامد تھا کہ وہ حالات کے مطابق تجزیہ کرنے کے قابل بھی نہ تھے اور نہ ہی مقررہ وقت تک کسی صحیح حکمت عملی اور طریقہ کار پر متفق ہو سکتے تھے۔ انہوں نے ایک مثال دی کہ مشرقی پاکستان کے ایک بائیں بازو کے راہنما ان سے صرف اس بات پر ناراض ہو گئے تھے کہ مسٹر بھٹو ہوائی اڈے سے سیدھے ان کے گھر جانے کے بجائے راستے میں ایک اور راہنما سے ملنے کے لئے گئے جو حال ہی میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔ یہ ایک معمولی سی بات تھی لیکن اس سے چند پرانے بائیں بازو کے راہنماؤں کی تنگ نظری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہوئے اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے بھٹو صاحب نے مجھے بتایا کہ ایوب خان نے اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں اپنی کابینہ کے ایک اجلاس میں صاف اور واضح طور پر کہا تھا کہ وہ کمیونزم اور سوشلزم کے دشمن ہیں۔ اور انکا صرف ایک دوست ہے اور وہ ہے امریکہ۔ اور یہ کہ وہ امریکہ کو جتنے بھی فوجی اڈے وہ چاہے خوشی سے دینے کو تیار ہیں۔ وہ صرف واشنگٹن میں اپنا سفارت خانہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ماسکو، بیجنگ اور وارسا وغیرہ میں سفارت خانوں کو وہ فضول اور بے ضرورت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی کابینہ کے اراکین کو ہدایات جاری کر دی تھیں کہ وہ سوشلسٹ ممالک کے سفیروں سے تعلقات نہ بڑھائیں اور نہ ان کی ہمت افزائی کریں۔ وہ اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے مسٹر منظور قادر پر صرف اس بات پر تنقید کی کہ انہوں نے اپنے گھر ایک دعوت میں فیض احمد فیض کو مدعو کر لیا تھا۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد شہید نے کہا "کوئی شخص بھی تاریخ سے زیادہ قد آور نہیں ہو سکتا۔ عظیم ترین آمر کو بھی وقت کے فیصلے کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔" اور چند دن بعد وہی ایوب خان جو سوشلزم کے دشمن تھے، روس اور چین کے ساتھ دوستی کی باتیں کر رہے تھے۔ یہ حقیقت

www.bhutto.org

ہمارے بائیں بازو کے کئی راہنماؤں کی سمجھ میں شاید نہ آئے کہ انہوں نے دو قدم آگے بڑھانے کے لئے ایک قدم پیچھے ہٹنے کے نظریئے پر دھیان نہیں دیا۔ انہوں نے حقائق کا اندازہ گھسے پٹے پس منظر سے لگایا۔ حالانکہ ان کو فارمولوں کے حقائق کی روشنی میں جانچنا چاہئے تھا۔ سیاست کا مطلب مواقع سے بہترین فائدہ اٹھانا ہے۔ اقتدار میں آنے کے بعد شہید چیئرمین کو ان کے ہم خیال اور وفادار کارکنوں سے علیحدہ کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ ہر تنظیم نو کی مہم میں زیادہ سے زیادہ خوشامدی، کاسہ لیس وزراء اور ارکان اسمبلی آگے آگئے۔ جب افضل وٹو پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر بنے تو وفادار اور نظریاتی کارکنوں کو بڑی تعداد میں پارٹی کے عہدوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ کئی نظریاتی کارکن مختار احمد جیسے مہم جو لوگوں کی وجہ سے پارٹی کے اہم حصے سے دور چلے گئے اور یہ تنظیم کمزور ہوتی چلی گئی۔ خوشامدی لوگوں نے وفادار کارکنوں کے خلاف سازش شروع کر دی اور چیئرمین کے کانوں میں ان کے خلاف زہر گھولنا شروع کر دیا۔ ہر ضلع میں اراکین اسمبلی نے پارٹی کے تمام عہدے اپنے دوستوں اور وفاداروں کو دینا شروع کر دیئے۔ جب بھی شہید نے ان کی نظریاتی پارٹی کے وفاداروں کی جنہوں نے ان کی جدوجہد میں شرکت کی تھی۔ دفاع کرنے کی کوشش کی تو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت ارکان اسمبلی کے گروہ نے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے سیکرٹری افضل سعید خان اور مشیر سیاسی امور حیات ثمن بھی ان نظریاتی کارکنوں کے خلاف اراکین اسمبلی کی حمایت کرنے لگے۔ اس طرح بھٹو گروپ سے تعلق رکھنے والے تمام کارکن آہستہ آہستہ پارٹی کے عہدوں سے ہٹا دیئے گئے۔

۱۹۷۴ء میں اپنے اضلاع کے دوروں کے موقع پر بھٹو صاحب نے محسوس کرنا شروع کیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے پنجاب کی پیپلز پارٹی کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے گورنر ہاؤس لاہور میں ایک اجلاس بلایا اور وہیں وزراء اور ارکان اسمبلی کی موجودگی میں پارٹی کے عہدہ داروں کی نامزدگی شروع کر دی۔ میرا نام فیصل آباد کی صدارت کے لئے زیر غور تھا اور بھٹو صاحب اس کی منظوری دینے ہی والے تھے کہ افضل سعید خان نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ جس کے فوراً بعد کئی وزراء اور ارکان اسمبلی نے مجھ پر ایک پکا کمیونسٹ اور انتہا پسند ہونے کے الزامات لگانا شروع کر دیئے۔ میرے ایک حمائتی نے میرا دفاع کیا لیکن اس وقت دباؤ اتنا بڑھ چکا تھا کہ بھٹو صاحب نے میرا نام صدارت کے عہدے سے خارج کر دیا۔ بعد ازاں جب جنرل سیکرٹریوں کے عہدے کے لئے ناموں پر غور کیا جانے لگا تو شدید مخالفت کے باوجود مجھے فیصل آباد میں پارٹی کا جنرل سیکرٹری بنا دیا۔ میرے تقرر کی اطلاع مجھے ایوان وزیراعظم سے ٹیلی فون کے ذریعہ موصول ہوئی۔ اس کے بعد بھٹو صاحب سوویت یونین کے دورے پر چلے گئے۔ دوسرے

www.bhutto.org

دن جب اخبارات میں عہدے داروں کی فہرست شائع ہوئی تو اس میں میرا نام نہیں تھا

میں نے کبھی بھی پارٹی کے کسی بھی عہدے کی پرواہ نہیں کی تھی لیکن کیونکہ میرے تقرر کی خبر لوگوں تک پہنچ گئی تھی اور وہ سب مجھے مبارک باد دینے آ رہے تھے۔ میرے نام کی غیر موجودگی کسی کا انفرادی جرم تھا۔ میں نے شہید کو لکھا کہ میں نے ان سے کسی عہدے یا کسی اور مہربانی کی خواہش نہیں کی تھی اور میں ہر طریقہ سے پارٹی کی خدمت کر رہا تھا لیکن مجھے اس بات کا صدمہ ہوا ہے کہ میرا نام ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اگر وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں تو میرے پاس بھی ان کو پسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن پارٹی چھوڑنے سے قبل میں ایک بار ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کے آس پاس رہنے والوں کے ہاتھ وہ خط آ گیا اور میرے جیسے آدمی کے خطوط ان تک کبھی نہ پہنچے چنانچہ میں نے اس خط کی بیس نقول تیار کیں اور دوسرے قائدین کو بھی ارسال کیں اور اس طرح کسی شریف آدمی کے ذریعہ وہ خط شہید تک پہنچ گیا۔ ناراض ہونے کے بجائے انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو حکم دیا کہ مجھے ملاقات کے لئے بلایا جائے۔ ملٹری سیکرٹری نے مجھے اطلاع دی کہ میری ملاقات منظور ہو گئی ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ملاقات کی تاریخوں کو بار بار ملتوی کرنا شروع کر دیا۔ متعدد خطوط کے بعد جن میں میں نے اس صورت حال کی شکایت کی تھی۔ ایک خط پھر بھٹو صاحب کو مل گیا اور مجھے ۱۳ر مئی ۱۹۷۵ء کو ایوان وزیر اعظم بلایا گیا۔

اس وقت دوپہر تھی اور وہ برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے سفید پتلون اور کالی قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے ملے اور میری آمد کا مقصد دریافت کیا۔ میں نے جواب دیا کہ "میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ میرا نام ناپسندیدہ اشخاص کی فہرست میں کیسے شامل ہو گیا۔ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور اس فہرست میں شامل ہونے کے قابل نہیں ہوں۔"

انہوں نے بڑے تحمل سے جواب دیا "یار! ہر وزیر رکن اسمبلی اور مشیر جس سے میں ملتا ہوں تمہارے خلاف بات کرتا ہے اور اس سے میری رائے بھی متاثر ہوتی ہے" میں نے جواب دیا "ان کو میرے خلاف باتیں کرنا ہی چاہئیں کیونکہ وہ تقریباً ہر رات شراب پینے کے بعد آپ کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ میں برداشت نہیں کرتا (ان میں چند باتیں میں نے ان کے سامنے دہرائیں)۔" مسئلہ یہ تھا کہ پارٹی کے کارکن ان تک پہنچ نہیں پاتے تھے اور وہ سب کچھ نہیں بتا پاتے تھے جو کہا اور کیا جا رہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس ان کے قریب رہنے والوں کو مواقع ملتے رہتے تھے کہ وہ ہمارے بارے میں جو چاہیں کہہ دیں۔

www.bhutto.org

وہ صحن میں لگے ہوئے درختوں کو تک رہے تھے اور جب میری طرف مڑے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے اپنے رومال سے آنسو پونچھے اور کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ میرے نہیں حکومت کے ساتھ ہیں۔ ہمارا نظام پارلیمانی ہے اور وہ گروہ بندی کر کے اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور عملاً مجھے بلیک میل کرتے ہیں۔ تم میری خاطر اس صورت حال کو مزید ایک دو سال تک برداشت کر لو۔ اگر میری حکومت کے دوران تم کو جیل بھی ہو جائے تو میری طرح برداشت کرنا۔ میں ان سب لوگوں کو ایک دو سال میں ٹھیک کر دوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے وفاداروں اور غریبوں کو کھلی کچہری میں بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ میں اپنے دوستوں کو پہچانتا ہوں لیکن وہ مجھے کھلی کچہریوں میں نظر نہیں آتے۔ وہ لوگ جنہوں نے میرے ساتھ جدوجہد کی اور جن کی وجہ سے آج میں اُس عہدے تک پہنچا ہوں ان کے زرد چہرے صرف بڑے عوامی جلسوں میں نظر آتے ہیں۔ میں ان چہروں کو دوبارہ دیکھنے کے لئے بے چین ہوں۔ ان کی بات سننے کو، ان سے بات کرنے کو اور ان کے لئے کچھ کرنے کو۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ میں نے جن کو پسند کیا تھا انہوں نے طالع آزمائی میں مجھے چھوڑ دیا۔ میں بھی ایک انقلابی ہوں لیکن ہم صرف اپنی مرضی سے انقلاب نہیں لا سکتے۔ میں نے ووٹ کے ذریعہ انقلاب کا تجربہ کیا ہے۔ یہ ایشیائی معاشرے میں ایک نیا تجربہ ہے۔ ایشیائی معاشرہ میں بہت ساری تبدیلیاں ہونا باقی ہیں۔ انقلاب کے راستے میں پہنچنے سے قبل ہم کو کئی دوسرے راستوں سے گزرنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی کوشش میں ناکام ہو جاؤں۔ یا اس راستے پر مارا جاؤں۔ کیونکہ میرے ساتھ کوئی ٹیم نہیں ہے جو ایسے کارنامے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اگر میرے ساتھ صرف دو سو اشخاص ہوں تو میں وہ کچھ کر دکھاؤں جس کا لوگ صرف تصور کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ بہت سے لوگ انقلاب کی باتیں کرتے ہیں لیکن عملاً ان میں کوئی بھی انقلابی نہیں ہے۔ تم میرے بیٹے کی طرح ہو۔ آگے بڑھو اور میرے لئے سیاست میں حصہ لو۔ آگے راستہ بہت مشکل ہے۔ تم ایک صحافی ہو۔ کوئی نظریاتی رسالہ جاری کرو۔ میں تمہاری ہر طرح مدد کروں گا۔"

مجھے ملاقات کے لئے صرف ۱۵ منٹ ملے تھے لیکن ۲۸ منٹ گزر چلے تھے اے ڈی سی دوبارہ آئے اور وقت ختم ہونے کا اشارہ کیا۔ جب میں واپسی کے لئے اٹھنے لگا تو شہید قائد نے مجھ سے بڑی شفقت سے دریافت کیا "کوئی درخواست"، "نہیں جناب" میں نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ شاید میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔" میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "وہ شفقت اور ہم خیالی جو میں نے آپ سے پائی ہے اس سے بہت زیادہ ہے جو

www.bhutto.org

میں آپ سے طلب کر سکتا تھا۔"

دو ماہ بعد میرے حلقے سے منتخب رکن اسمبلی چوہدری محمد اسلم انتقال کر گئے اور ان کی جگہ خالی ہو گئی۔ شہید نے مجھے ڈاکٹر مبشر حسن کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ میں اس نشست کے ٹکٹ کے لئے درخواست دوں لیکن کیونکہ میں نے راجہ بہادر خان سے حمایت کا وعدہ کر لیا تھا میں نے ڈاکٹر مبشر سے کہا کہ وہ چیئرمین سے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کر دیں کہ اگر وہ ٹکٹ راجہ بہادر خان کو دے دیں تو یہ مہربانی میرے ساتھ ہوگی۔ بااثر لوگوں نے میری تضحیک کی اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ راجہ بہادر خان کو ٹکٹ دیا جائے جو ایک چھوٹے درمیانے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چیئرمین نے راجہ کو ٹکٹ دے کر مجھے سُبکی سے بچالیا۔

جب آمر ضیاء نے ان کو مری میں قید سے آزاد کیا تو میں ان سے ملنے لاڑکانہ گیا ہزاروں لوگ ان کو مبارک باد دینے آئے ہوئے تھے میں بھی اس مجمع میں شامل ہو گیا۔ وہ اندر سے گیارہ بجے دن کو باہر آئے تو مجمع نعروں سے گونج اٹھا۔ انہوں نے مجمع سے خطاب کیا اور پھر واپس مہمان خانے میں چلے گئے جہاں پارٹی کے دیگر قائدین موجود تھے۔ میں بھی اندر جانے میں کامیاب ہو گیا اور ان کو سلام کیا۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور ہدایت کی کہ میں پارٹی کے ٹکٹ کی درخواست دوں چنانچہ ہدایت کے مطابق میں نے صوبائی اسمبلی کے لئے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نشست کے لئے درخواست ارسال کر دی۔ لیکن جب ٹکٹ حاصل کرنے والوں کی فہرست شائع ہوئی تو اس میں میرا نام نہیں تھا۔ بھٹو صاحب نے ڈاکٹر اشرف عباسی صاحبہ کو فیصل آباد میں ٹکٹوں کے مسئلہ کی پڑتال کے لئے بھیجا اور ان کو خصوصی طور پر مجھ سے ملنے کی ہدایت کی۔ ڈاکٹر صاحبہ غالباً ۱۹ر اگست کو وہاں پہنچیں اور مجھ سے کہا کہ میں لاڑکانہ جا کر بھٹو صاحب سے ملاقات کروں۔ وہ مجھے یقیناً ٹکٹ دیں گے کیونکہ انہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ مجھے کس سازش کے تحت ٹکٹ سے محروم کیا گیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کو جواب دیا کہ میں چیئرمین کے حکم کی تعمیل ضرور کروں گا لیکن میں اپنے لئے پارٹی کے ٹکٹ کے سلسلے میں ان سے نہیں ملوں گا۔

ڈاکٹر صاحبہ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں پارٹی کے جنرل سیکرٹری طارق سعید کو کہا کہ وہ بھٹو صاحب کے پاس جائیں اور میرے لئے ٹکٹ لے کر آئیں۔ لہٰذا طارق سعید بھٹو صاحب سے ۲۱ر تاریخ کو لاڑکانہ میں ملے۔ جوں ہی طارق سعید نے میرے متعلق بات شروع کی تو شہید نے میرے خود نہ آنے کی وجہ دریافت کی کیونکہ مجھ سے کوئی اہم گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے طارق سعید کے توسط سے مجھے ہدایت کی وہ ۲۴ تاریخ کو اسلام آباد پہنچ جائیں گے اور یہ کہ میں وہاں ان سے

www.bhutto.org

ملاقات کروں۔ انہوں نے نور محمد مغل کو ہدایت کی کہ جب بھی ایک ڈاڑھی موچھ والا صحافی ان سے ملنے آئے، اسے اندر بلا لیا جائے۔ میری شہید سے ملاقات اسی ہدایت کے نتیجے میں ہوئی۔ اس دن ۲۵ر تاریخ تھی اور وہ پیر کھڈ کے گھر پر قیام پذیر تھے۔ نور محمد مغل نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جہاں ڈاکٹر عباسی اور ڈاکٹر غلام حسین پہلے سے موجود تھے۔ شہید نو بجے صبح سیڑھیوں سے اترے اور سیدھے میری طرف آئے اور شفقت سے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ہمیشہ برا ہوا ہے۔ تمام ذہین لوگ جو غریب ہیں اسی طرح نقصان اٹھاتے ہیں۔ ان کا جرم صرف ان کی قابلیت ہے۔ لیکن میں تم کو ٹکٹ دوں گا۔ بدقسمتی سے تم جیسا قابل شخص پارٹی کے اراکین کے درمیان ٹکٹوں کی رسہ کشی میں نظر انداز ہوتا رہا میں تم کو مرکزی کمیٹی کے اپیل بورڈ میں بلاؤں گا۔ مصطفیٰ کھر تمہاری مخالفت کرے گا لیکن تم اس کو اچھا سبق پڑھا دینا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ انتخابات ہوں گے نہیں۔ لہٰذا ان کو بھول جاؤ ٹکٹ دینے کا مقصد صرف خدمات کا اعتراف ہے۔ یہ لیڈر سمجھ رہے ہیں کہ انتخابات ہوں گے لیکن ان کو کچھ نہیں معلوم، ہو سکتا ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔ تم کو وعدہ کرنا ہے کہ اگر میں ہلاک کر دیا گیا تو تم میرے خاندان کا ساتھ دو گے۔ میرے بعد تم بیگم بھٹو اور بے نظیر کی حمایت کرو گے۔ وہ میری جگہ پارٹی کا کام سنبھالیں گی۔"

میری زبان گنگ ہو گئی۔ اور پھر میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں ان کی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا "جناب چیئرمین! دنیا کی کوئی طاقت ہم کو آپ سے جدا نہیں کر سکتی۔ میں اور میرے جیسے لاکھوں غریب ہمیشہ آپ اور آپ کے خاندان کے ساتھ رہیں گے۔ وقت یہ ثابت کرے گا کہ ہم جیسے غریب لوگ آپ کے وفادار ہیں یا مصطفیٰ کھر یا صادق قریشی جیسے جاگیردار" انہوں نے میرے رخسار پر تھپکی دی اور کہا "میں جانتا ہوں کہ تم جیسے لوگ مقصد کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں۔ یہ جاگیردار، وڈیرے اور سرمایہ دار کبھی میرے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف میری مقبولیت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ میں تمہارا ہوں، میں غریبوں سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان کو ان کی میٹھی خوشبو سے پہچان لیتا ہوں۔ اور جب بھی ان کو میری خوشبو آ جاتی ہے وہ میری طرف آ جاتے ہیں۔ چاہے میں زندہ رہوں یا مار دیا جاؤں، میں جانتا ہوں کہ میں غریب عوام کے دلوں کی دھڑکنوں میں زندہ رہوں گا۔ وہ ایک باغی تھے۔ اپنے ہی طبقے سے باغی۔ وہ ایک سیاست کے سائنس دان تھے۔ لیکن ان کے ساتھ مخلص لوگ نہیں تھے جو عوام کو منظم کر سکتے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہوں نے ووٹ کے ذریعہ عوام کے جمہوری انقلاب کی بنیاد رکھی وہ ملک کو ایک حقیقی جمہوریت کے راستے پر لے جانا چاہتے تھے لیکن پارٹی کے

www.bhutto.org

اندر اور باہر استحصالی قوتوں اور دشمنوں نے ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔
ہم نے مسیحا کھو دیا۔ اب ہم اس کا خمیازہ اٹھاتے رہیں گے۔ ان کو قتل کر دیا گیا۔

شہید بھٹو زندہ باد۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

شہید ذوالفقار علی بھٹو سے میری پہلی ملاقات

شیخ رفیق احمد

شہید ذوالفقار علی بھٹو سے میری ملاقات لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں اس وقت ہوئی تھی جب انہوں نے چند دن قبل ایوب خان کی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس وقت پیپلز پارٹی وجود میں نہیں آئی تھی اور نہ ہی "فخرایشیا"، "قائدعوام" اور "تیسری دنیا کے راہنما" جیسے خطابات ان سے منسوب کئے گئے تھے۔ یہ خطابات قوم نے ان کو بعد میں دیئے تھے۔

دراصل یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔ میری پہلی ملاقات بہت مختصر اور سرسری سی تھی جو چند سال قبل اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن واپس پہنچے تھے اور میں کراچی میں ان کے گھر میاں افتخار الدین کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن لاہور میں اپنی دوسری ملاقات پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہید نے مجھے ان کے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہچان لیا۔ بعد میں مجھے تجربہ ہوا کہ یہ ان کا معمول اور وصف تھا کہ وہ اس شخص کو فوراً پہچان لیتے تھے جس سے وہ پہلے کبھی مل چکے ہوں۔ چاہے وہ شخص ان کو صرف ایک بار اور لاکھوں کے مجمع میں ملا ہو۔

میں نے ان کو بتایا کہ میں ہمیشہ سے ایوب خان کے خلاف رہا ہوں۔ اور ایوب خاں کی کابینہ کے صرف وہ ایک وزیر ہیں جن کا میں اور میرے تمام ساتھی بے حد احترام کرتے ہیں۔ میں نے ان کو یہ بھی بتایا کہ ایوب خان کی کابینہ میں وزارت کے دوران بھی وہ نوجوانوں میں بہت

www.bhutto.org

مقبول رہے ہیں۔ اور یہ کہ وہ بڑے شاندار طریقے پر ملک، عالم اسلام اور ان تمام اشخاص جن کے ساتھ انہوں نے مختلف وزارتوں میں کام کیا۔ کی خدمت کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

"ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

میرے اس سوال پر کہ ان کی ایوب خاں کی کابینہ سے علیحدگی کے اسباب کیا تھے؟ انہوں نے جواب دیا "فوری وجہ تو خارجہ پالیسی میں اختلافات تھے جیسا کہ اب ہر شخص کو معلوم ہے۔ بہرحال میں جس دن سے وزیر بنا تھا مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں اس حیثیت میں عوام کی اس طریقہ پر خدمت نہیں کر پاؤں گا جس طرح میں چاہتا ہوں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "میں بچپن ہی سے جب بھی عام لوگوں کے مسائل اور محرومیوں کو دیکھتا تھا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا تھا۔ جب مجھے وزیر بنایا گیا تو میرا خیال تھا کہ میں کچھ حد تک ان کے مسائل کو حل کر پاؤں گا لیکن وہ ممکن نہیں ہو سکا کیونکہ اقتدار اور اختیارات صرف چند اشخاص کے ہاتھ میں تھے۔ عوام مجبور اور غلام ہیں" ان کے بعد انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

گو ابر و باد و رنگ جہاں بہت حسین ہے
مگر یہ قطعہ زمین غموں سے چور چور ہے

انگریزی زبان میں گفتگو کے دوران ان کی زبان سے اردو کا یہ شعر سن کر میں حیران رہ گیا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اردو شاعری سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا اور ان کی پرورش مغربی طرز کے آرٹ اور ادب کے ماحول میں ہوئی تھی۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ وہ شعر جو مجھے اب تک یاد ہے اتفاقیہ طور پر ان کے ذہن میں آ گیا ہو گا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان کے پاس میرے لئے مزید ذخیرہ موجود تھا۔

اپنی آخری جنگ میں عدالت عظمیٰ میں انہوں نے غالب کا یہ شعر پورے عبور کے ساتھ پڑھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

"کیا ہم کسی دن آپ کو بدھا کی طرح جنگلوں میں کھو دیں گے جو نجات حاصل کرنے کے لئے وہاں چلا گیا تھا" میں نے ان سے مزاقاً کہا۔

شہید اٹل اور سنجیدہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا "نہیں! میں اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دوں گا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہر آدمی، عورت، بچے، بوڑھے اور نوجوان ان بادلوں اور رنگین دنیا میں میرے ساتھ برابر سے شریک ہوں۔" اور انہوں نے اس سچائی کو ثابت کر دکھایا

www.bhutto.org

کام اور صرف کام

ایف۔ کے۔ بندیال

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را

○..........☆..........○

اگر تم چاہتے ہو کہ پرانی یادیں
تمہارے سینوں میں تازہ رہیں تو
ماضی کے واقعات کو یاد کرتے رہا کرو

○..........☆..........○

میں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں کئی ذمہ دار عہدوں پر کام کیا ہے مثلاً کمشنر، راولپنڈی ڈویژن، چیف سیکرٹری پنجاب، چیف سیکرٹری صوبہ سرحد اور وفاقی سیکرٹری۔

ان عہدوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ یہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے مواقع پیدا کرتے تھے (اور اب بھی کرتے ہیں) اور یہ کہ ان کی وجہ سے وزیراعظم کا قرب حاصل ہو جاتا تھا۔

www.bhutto.org

وہ کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ ان واقعات کا مجموعہ ہے جو میں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے پاکستان کے صدر اور وزیر اعظم کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے دوران مختصر وقت اور خاص مواقع پر دیکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے مکمل نہیں ہوں گے اور نہ ہی مناسب طریقہ پر ان کے پائے کے راہنما کی خوبیاں بیاں کر سکیں گے۔ میں اپنی یادوں کو ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے ہم مرتبہ لوگوں سے مطابقت رکھتی ہوں اور میرے ساتھیوں یعنی نوکر شاہی کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں۔

میری بھٹو صاحب سے پہلی دو ملاقاتوں کے درمیان تقریباً تین سال کا وقفہ تھا جو نوعیت کے مطابق ایک دوسرے سے بالکل مختلف حالات میں ہوئی تھیں۔ یعنی ایک جیل میں اور دوسری ایوان حکومت میں۔

۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان کی حکومت نے ان کو ایم پی او کے تحت منٹگمری (ساہیوال) جیل میں نظر بند کر دیا تھا۔ ان کی طرف سے شکایت موصول ہونے پر کہ جیل کی حالت غیر معیاری ہے اور ان کے ساتھ مناسب رویہ اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ نے ہدایات جاری کیں کہ ان کو ڈسٹرکٹ جیل لاہور منتقل کر دیا جائے اور اے کلاس دی جائے۔

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہونے کی حیثیت سے میں نے یہ اپنا فرض منصبی سمجھا کہ جیل جا کر دیکھوں کہ ان کو وہ مراعات حاصل ہو گئی ہیں۔ میں ایس ایس پی لاہور اور سپرنٹنڈنٹ جیل کو ساتھ لے کر جیل پہنچا۔ میں نے ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے جواب آیا "اندر آ جایئے۔" وہ سردیوں کی رات تھی۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور میز کے پہلو میں لگے ہوئے لیمپ کی روشنی میں پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنا اور اپنے ساتھیوں ایس ایس پی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کا ان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ ہم یہ دیکھنے آئے ہیں کہ ان کو مطلوبہ مراعات حاصل ہو گئی ہیں۔ انہوں نے اپنا سر ہلایا اور سراہتے ہوئے کہا "جی ہاں! آپ کا شکریہ میں بالکل آرام سے ہوں" چند لمحے رکنے کے بعد انہوں نے مزاح کے انداز میں کہا "مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا کیونکہ باہر اس کے حوالے دیئے جائیں گے"

نہیں! یہ مقصد نہیں ہے" میں نے شائستگی سے جواب دیا اور پھر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ وہ ان تکلیف دہ حالات میں بھی کس قدر بشاش اور بے فکر نظر آ رہے تھے۔

میری دوسری ملاقات یکسر مختلف حالات میں ہوئی تھی اس وقت وہ صدر پاکستان تھے اور

www.bhutto.org

میں کچھ عرصہ پہلے ہی فروری ۱۹۷۲ء میں بطور ممتنز راولپنڈی ڈویژن تعینات ہوا تھا۔ ان سے ملاقات کے لئے اپنی آمد کا اندراج میں نے مہمانوں کی کتاب میں کیا اور مجھے وقت ملنے میں جو مستعدی دیکھنے میں آئی وہ میرے لئے ایک خوشگوار اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کئی سال کے مارشل لاء کے اثرات اور اس کے نتیجہ میں سقوط پاکستان کے باوجود صدر کس قدر منظم اور قابل رسائی تھے۔

ہم کو احکام موصول ہوئے کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صدر پاکستان کے عہدے کا حلف ایک عوامی تقریب میں اٹھائیں گے جو ریس کورس گراؤنڈ راولپنڈی چھاؤنی میں ۲۱ر اپریل ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوگی۔

اس موقع پر تمام انتظامات جن میں حفاظتی اقدامات اور نظم و ضبط شامل تھے ضلعی انتظامیہ کی ذمہ داری تھی۔

وفاقی حکومت نے اپنی دانشمندی دکھانے کے لئے اپنے سیکریٹریوں کی ایک کمیٹی ان کی نگرانی اور مدد کے لئے مقرر کر دی۔ جلسہ گاہ کا نقشہ اور آنے جانے کے راستوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ چبوترہ (اسٹیج) ریس کورس گراؤنڈ کے پشاور روڈ کی جانب صدر دروازے کے ساتھ بنایا جائے تاکہ پورا میدان لوگوں کے لئے خالی رہ سکے اور چبوترے کے نیچے دائیں اور بائیں پہلو پر کرسیاں لگا دی جائیں۔ اس طریقہ سے عوام میں افراتفری کی صورت میں حفاظتی اقدامات میں کوئی خلل نہیں پڑے گا اور صدر کو آتے اور واپس جاتے وقت کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہوگا۔ تمام انتظامات منصوبہ کے مطابق جاری تھے کہ عین آخری وقت پر نگراں کمیٹی کے ایک رکن نے اپنی بالادستی کی حیثیت استعمال کرتے ہوئے ہمارے انتظامات کو رد کر دیا اور حکم دیا کہ چبوترہ میدان کے عین وسط میں منتقل کیا جائے۔ میں نے اس تجویز سے اختلاف کیا کیونکہ اس طریقہ سے عوام میں بھگدڑ یا افراتفری کی صورت میں جو عام طور پر ایسے مواقع پر دیکھنے میں آتی ہے، تمام حفاظتی انتظامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور مثال دی کہ فوجی پریڈ کے ایک موقع پر بھی اہم فوجی شخصیت جنہوں نے پریڈ کا معائنہ کرنا تھا، کے لئے بھی میدان کے وسط میں چبوترہ بنایا گیا تھا۔ ہمیں اُس اور موجودہ تقریب میں کوئی مماثلت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن بہرحال ہم کو حکام بالا کے احکام کی تعمیل کرنا پڑی اور میدان کے وسط میں چبوترہ تعمیر کرنا پڑا اور وہیں وہ تقریب منعقد ہوئی۔ ان لوگوں کو جو وہاں موجود تھے یا جنہوں نے اسے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا یاد ہوگا کہ وہ تقریب کسی ہنگامہ آرائی پر ختم ہوئی تھی۔ ایک بڑے مجمع نے جو جوش اور افراتفری سے بے قابو ہو گیا تھا تمام انتظامات درہم برہم کر دیئے تھے۔ اس موقع پر طاقت کا استعمال بھی

www.bhutto.org

نہیں کیا جا سکتا تھا اور بڑی مشکل سے صدر کو وہاں سے لے جایا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی غفلت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا وفاقی حکومت نے اس واقعہ کی ذمہ داری کا تعین کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی۔ ہم چاروں یعنی کمشنر، ڈی آئی جی، ڈپٹی کمشنر، راولپنڈی اور ایس ایس پی راولپنڈی کو واقعات بتانے کے لئے طلب کر لیا گیا۔ کمیٹی میں بعض شناسا چہرے بھی موجود تھے جن کو ہم نے انتظامات کی اعلیٰ نگراں کمیٹی کے ارکان کے طور پر دیکھا ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے انتظامات کو رد کر کے اب وہ ہم ہی سے وجوہ معلوم کر کے اس کی رپورٹ پیش کرنے پر معمور تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم سے سوالات کرنے سے بہتر یہ ہو گا کہ وہ اس واقعہ کی ذمہ داری خود قبول کر لیں۔ ان کے اجتماعی فیصلے میں ہم کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ ہم کو اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ لیکن دو ایک دن بعد ہی ہم کو وفاقی حکومت کی طرف سے جو کچھ موصول ہوا وہ ناراضگی نہیں بلکہ خوشنودی کا اظہار تھا۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جلد ہی ہم کو معلوم ہو گیا کہ وہ تعریفی خط جناب صدر کی مداخلت پر جاری کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اپنے طور پر اس واقعہ کی تحقیقات کی تھی اور وہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ یہ بات ہمارے لئے بڑی ہمت افزا اور خوشگوار تھی کیونکہ اس طرح کی صورت حال میں سچائی دبا دی جاتی ہے اور جب وہ سامنے آتی ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

بھٹو صاحب کام کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ وہ بہت باصلاحیت تھے اور کام اور اس کے نتائج چاہتے تھے۔

کمشنر راولپنڈی ڈویژن کی حیثیت سے میں کبھی کبھی محسوس کرتا تھا کہ شاید کام ٹھیک نہیں ہو رہا ہے اور میں بار بار ان کی ناراضگی کا شکار ہو رہا ہوں۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ وہ اپنی ناراضگی کا اظہار صرف زبانی طور پر کرتے تھے۔ اور اس وقت کرتے تھے جب میں اور وہ تنہا ہوتے تھے۔ اس صورت حال سے دلبرداشتہ ہو کر میں ارادہ کر رہا تھا کہ طویل رخصت پر چلا جاؤں۔ میں نے اپنی بیگم کو اس صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس سے بچنے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لوں۔ بیگم نے بڑے تحمل سے اپنا نکتہ نظر بیان کیا جس سے میں قدرے مطمئن ہو گیا انہوں نے کہا "اگر وہ واقعی ناراض ہوتے تو کیا آپ یہاں ہوتے" بات واقعی صحیح تھی۔

بھٹو صاحب پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک ایم پی اے سے سخت ناراض تھے۔ کیونکہ وہ ایک طے شدہ وقت پر وزیر اعظم سے ملنے نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کا تعلق ٹیکسلا سے تھا۔ وزیر اعظم کی

www.bhutto.org

طرف سے مجھے حکم ملا کہ وہ اس دانستہ غفلت پر اس کی جواب طلبی کریں۔ میری ابتدائی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ وہ ان کی پارٹی میں اندرونی جھگڑے کا معاملہ تھا۔ اس میں دو گروپ تھے۔ ایک مذکورہ ایم پی اے اور گوجر خان کے ایم این اے کا اور دوسرا راولپنڈی سے ایک ایم این اے اور ایم پی اے کا تھا۔

ہم نے اس کو بہت تلاش کیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ لاہور چلا گیا ہے۔ بھٹو صاحب نے مجھ سے اس معاملہ کی رپورٹ طلب کی لیکن بدقسمتی سے میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت ناراض ہوئے کہ میں نے اس معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

دوسرے دن وہ لاہور گئے جہاں فریقین کے تنازعہ کو باہمی رضامندی اور گورنر پنجاب کی مداخلت سے طے کر لیا گیا۔ وزیراعظم مطمئن ہو گئے اور مجھے لاہور سے ہدایات موصول ہوئیں کہ میں اس معاملہ میں کوئی پیش رفت نہ کروں۔ اس سے مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا لیکن ایک خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا کہ وزیراعظم سمجھ رہے ہوں گے کہ میں نے اس تنازعہ سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ یہ ٹھیک بھی تھا لیکن میں نے ایسا مختلف وجوہات کی بناء پر کیا تھا۔

دو ایک ماہ کے بعد اپریل ۱۹۷۴ء میں میرا تقرر چیف سیکرٹری پنجاب کے طور پر ہو گیا۔ اپنی نئی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے لاہور روانگی سے قبل میں نے وزیراعظم سے قومی اسمبلی میں ان کے چیمبر میں ملاقات کی اور ان سے ایم پی اے کے متذکرہ بالا واقعہ کو بیان کیا۔ تو "انہوں نے جواب دیا۔ "اسے بھول جائیں" میں اس کو آپ پر نہیں ڈالتا اگرچہ آپ نے گورنر کے احکام کے مطابق کارروائی نہیں کی تھی" میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "جناب میں گورنر اور وزیراعظم کی حکم عدولی کس طرح کر سکتا تھا لیکن میں ذاتی طور پر محسوس کرتا تھا کہ پی پی پی کے اندرونی معاملے میں ایک ایم پی اے کے خلاف کارروائی کرنے میں جلد بازی نہ تو وفاداری ہو گی اور نہ وزیراعظم کی خدمت کیونکہ وہ پارٹی کے چیئرمین بھی تھے۔ یہ کوئی برابری کا میچ نہ ہوتا" میں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی باتوں میں سچائی نظر آتی ہے" وزیراعظم نے قدر دانی کے انداز میں جواب دیا۔ ان کا اعتماد اور عالی ظرفی اس امر سے بھی عیاں تھی کہ انہوں نے مجھے ایک بڑی ذمہ داری کا عہدہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن پھر بھی میری طرف سے کوتاہی یا ذہنی انتشار ان کے ذہن میں موجود تھا۔

۷۵ - ۱۹۷۴ء میں صوبہ سرحد میں نظم و ضبط کے حالات واقعی بہت ابتر ہو گئے تھے۔ بم پھٹنے اور دہشت گردی کے واقعات روز کا معمول بن گئے تھے۔ ابتدائے فروری ۱۹۷۵ء میں حیات محمد خان شیر پاؤ کو ہلاک کر دیا گیا جس کے نتیجے میں صوبائی حکومت کو برخاست کر کے گورنر راج

www.bhutto.org

قائم کر دیا گیا اور مجھے وہاں بطور چیف سیکرٹری تعینات کر دیا گیا۔

میرے فرائض سنبھالنے کے چند دن بعد ہی وزیر اعظم پشاور آئے اور میں نے ان سے ایک خصوصی ملاقات میں اپنے اوپر خاص طور پر تفویض کردہ فرائض کے بارے میں ہدایات حاصل کیں۔ "ہر قیمت پر نظم و نسق کی بحالی۔ اس میں آپ کو میری پوری مدد حاصل ہوگی۔ مجھے نتیجہ چاہئے۔" وزیر اعظم نے کہا۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ کیا چاہتے تھے۔

ایک وفاقی وزیر کی بار بار آمد ہمارے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی ان کے صوبہ سرحد میں جلسے اور تقاریر زمینداروں اور مزارعوں کے درمیان کشیدگی پھیلا رہی تھیں اور ہم چاہتے تھے کہ وہ اس سے اجتناب کریں۔ لہٰذا جب وہ دوبارہ پشاور آئے تو میں ان کے پاس گیا اور ان کو بتایا کہ ان کا عوامی جلسہ ممنوع کر دیا گیا ہے اور یہ کہ وہ مزید پیش رفت کی زحمت نہ کریں۔ اس پر وہ بہت دلبرداشتہ ہوئے اور احتجاجاً اسلام آباد چلے گئے۔ مجھے فوراً وزیر اعظم سے ملنے کے لئے راولپنڈی طلب کیا گیا۔ مذکورہ وزیر بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے ان عوامل کی وضاحت کی جن کی بناء پر مجھے وہ کاروائی کرنا پڑی تھی۔ میں نے وزیر موصوف کو بتایا کہ ہمارا مقصد ان کے ساتھ بداخلاقی یا ان کی بے عزتی کرنا نہیں تھا وزیر اعظم نے ہماری باتیں بڑی توجہ سے سنیں اور میانہ روی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ مجھے وزیر مذکورہ کو بروقت مطلع کر دینا چاہئے تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے وزیر صاحب سے کہا کہ اگر کابینہ کے ارکان تعاون نہیں کریں گے تو نظم و ضبط قائم کرنے والے ادارے کس طرح حالات پر قابو پا سکیں گے۔

جب وزیر موصوف وہاں سے چلے گئے تو وزیر اعظم نے مجھ سے کہا وہ میری کارکردگی سے بہت خوش ہیں جس کے ذریعے صوبے میں حالات پر قابو پا لیا گیا تھا۔ ابتدا میں نہ جانے میں کیا کیا سوچ رہا تھا لیکن ان کی باتیں سن کر میں مطمئن ہو گیا اور وہ اپنے الفاظ پر ایک سینئر رکن کے مقابلہ میں قائم رہے۔

صوبہ سرحد میں قبائلی علاقے بھی ہیں جن کی اپنی علیحدہ روایات ادارے اور انتظامی طریقہ کار ہیں۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ان علاقوں کا طوفانی دورہ کیا۔ وہ مہمند، خیبر، قرم، اورکزئی، شمالی اور جنوبی وزیرستان ایجنسیوں میں گئے۔ وہ ان ایجنسیوں کے قلب تک گئے اور وہاں عوامی جلسے منعقد کئے۔ ان کا یہ بالکل غیر روائتی اور دلیرانہ اقدام حفاظتی عملے کے لئے پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ وقت سے مطابقت نہ رکھنے والا بدعنوان اور غیر نمائندہ سرداری رواج اگر مکمل طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا تو کم از کم اس پر برتری ہی حاصل کی جائے اور براہ راست عام آدمی تک پہنچا جائے۔ ان کا حتمی مقصد ان علاقوں میں بالغ رائے دہی کے

www.bhutto.org

نظام کو متعارف کرانا تھا ایک مقصد جو آج تک ایک مغالطہ بنا ہوا تھا۔ اس علاقے کے لوگ اور خفیہ اداروں کے لوگ آج بھی ان کے اس نظریئے اور دلیرانہ آرزو کو یاد کرتے ہیں۔ آج وہ موجود نہیں لیکن ان کی داستانیں باقی ہیں۔

شاندار وجود کا ایک گھنٹہ گمنامی کی پوری زندگی کے برابر ہوتا ہے۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

اک نعرہ بنا ہے اس کا لہو

حبیب جالبؔ

مسٹر بھٹو قتل کر دیئے گئے اور شہادت کا مرتبہ پایا۔ یہ دراصل پاکستان میں آزادی، انسانیت اور جمہوریت کا قتل تھا۔ میں ان سے پہلی بار اس وقت ملا تھا جب انہوں نے ایوب حکومت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور دور دور تک یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ ایوب چاہتے تھے کہ وہ سیاست چھوڑ دیں اور ملک سے باہر چلے جائیں۔ میں نے اس وقت یہ نظم لکھی۔

دست خزاں میں اپنا چمن چھوڑ کے نہ جا
آواز دے رہا ہے وطن چھوڑ کے نہ جا
تیرے شریک حال ہیں منصور اور بھی
سونی فضائے دار و رسن چھوڑ کے نہ جا
کچھ تیری ہمتوں پہ بھی الزام آئے گا
مانا کہ راستہ ہے کٹھن چھوڑ کے نہ جا
اے ذوالفقار تجھ کو قسم ہے حسین کی
کہ احترام رسم کہن، چھوڑ کے نہ جا

اسی دن روزنامہ "نوائے وقت" نے یہ نظم شائع کی اور اس دن اخبار کالے بازار میں

www.bhutto.org

پانچ روپے فی کاپی کے حساب سے فروخت ہوا۔ بھٹو صاحب مہربانی فرماتے ہوئے مجھ سے کافی ہاؤس میں ملنے آئے۔ ان میں یہ وصف تھا کہ وہ لوگوں سے براہ راست ملتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ہمہ وقتی شخصیت تھے۔ وہ ملک کے کونے کونے میں گئے اور ہر گھر کے دروازے پر دستک دی۔ قریہ قریہ انہوں نے لوگوں سے رابطہ کیا۔ ان کے درد اور تکالیف کو محسوس کیا اور ان کے مسائل کو سمجھا۔ انہوں نے کسانوں اور محنت کشوں کے مسائل معلوم کرنے کے لئے کافی تگ ودو کی اور جلد ہی وہ ان کی آواز بن گئے۔ جب کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی جاگیر دار اور وڈیرا کسی عام آدمی تک کبھی نہیں پہنچا تھا۔ سردی ہو یا گرمی بھٹو ان کے پاس پہنچتے تھے کیونکہ وہ ان سے مختلف تھے۔ انہوں نے دانشوروں اور شعراء سے تعلقات قائم کئے اور پھر ہمارے دوست اور سرپرست بن گئے۔

انہی دنوں لاڑکانہ میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا منتظمین نے کسی کو آنے والے شعراء کے لئے میزبان بنانا چاہا۔ بھٹو صاحب نے مجھے اور فیض صاحب کو مدعو کیا کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔ اور ہم کو ان کے ساتھ مختلف مسائل پر تفصیل سے تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ میں نے تاشقند پر ان کے نظریات سے اتفاق کیا حالانکہ میں بھارت کے ساتھ امن چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں ___ فیض صاحب ان سے گفتگو کر رہے تھے بھٹو صاحب نے مجھ سے رائے معلوم کی۔ میں نے جواب دیا کہ میں کچھ کہنے کی بجائے دو مدبروں کی گفتگو سننا زیادہ پسند کروں گا۔ میں نے ایوب کی کبھی حمایت نہیں کی ہم سب ان سے اکتا گئے تھے۔ اور بھٹو ہماری امید تھے۔

کل تک ہم بھٹو کے ساتھ تھے آج ہم ان کی بیٹی کے ساتھ ہیں۔ وہ بھی ہماری امید ہیں۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہم کو پھر سے ایک ہمہ وقت رہنما مل گئی ہیں۔ جو اپنے ذاتی غموں یعنی باپ کا قتل، بھائی کا قتل اور شوہر کی قید کے باوجود باحوصلہ اور دلیر ہیں اور خوش رہتی ہیں میں ان کی حوصلہ مندی وجرأت کو سلام کرتا ہوں۔ اب میں اپنی ایک نظم کے اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جو بھٹو صاحب کو بہت پسند تھے۔

خطرہ ہے زرداروں کو، گرتی ہوئی دیواروں کو
صدیوں کے بیماروں کو، خطرہ میں اسلام نہیں
ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہیں آخر چند گھرانے کیوں
نام نبی کا لینے والے الفت سے بیگانے کیوں
خطرہ ہے خونخواروں کو، رنگ برنگی کاروں کو
امریکا کے پیاروں کو، خطرے میں اسلام نہیں

www.bhutto.org

میں نے یہ نظم ایک عوامی جلسے میں پڑھی جس کے نتیجے میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ بھٹو صاحب نے فوراً میرے لئے وکلاء کا انتظام کیا اور ان پر زور دیا کہ وہ میری پیروی کریں اور میری ضمانت کرائیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب انہوں نے بھٹو صاحب کو گرفتار کیا تو بیگم نصرت بھٹو نے مجھ سے پوچھا "جالب بھائی! کیا وہ کبھی ان کو رہا بھی کر دیں گے۔"

میں نے جواب دیا تھا "ہم زنجیریں توڑ دیں گے۔ ہم جیل کی دیواریں گرا دیں گے! ہم ان کو واپس لائیں گے" مجھے فخر ہے کہ بیگم بھٹو نے مجھے اپنا بھائی کہہ کر مخاطب کیا حالانکہ میں ایک فقیر ہوں ـــــ معمولی فقیر۔

بھٹو صاحب کی بیٹی اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ میں بھی پانچ بیٹیوں کا باپ ہوں۔ مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو میں ولولہ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کے مسائل اور مصیبتوں کو جانتی ہیں۔

یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض راہنما اقتدار میں آ کر عام انسانوں کو کیوں بھول جاتے ہیں اور ان کی خدمت نہیں کرتے۔ میں یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ وہ قوم کی خدمت کے سلسلے میں اتنے بے بس کیوں ہو جاتے ہیں۔ بے ضرورت اتنا جو خرچہ کیا جاتا ہے۔ بے تحاشا ضائع کیا جاتا ہے۔ غیر پیداواری مدات میں خرچہ کیا جاتا ہے۔ اتنی بڑی فوج کی ہم کفالت کر رہے ہیں اور جس کی سربراہی میں آدھا ملک ہاتھ سے نکل گیا اور جو عوام پر مظالم اور ان کا استحصال کر رہی ہے

ایک موقع پر میاں محمود علی قصوری نے بھٹو صاحب سے کہا کہ جالب پی پی پی کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا لہٰذا ان کو ایم این اے کے لئے ٹکٹ ملنا چاہئے۔ بھٹو صاحب نے جواب دیا "آپ کو اس کی سفارش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں اس کے انتخابی جلسوں میں شرکت کروں گا۔ ان سے خطاب کروں گا اور رقم بھی دوں گا۔"

اب میری کوئی خواہش نہیں ہے۔ میری صحت گر رہی ہے۔ میں اپنی بیٹی بے نظیر کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرے۔ اللہ تعالیٰ ان کو پاکستان کے دشمنوں کے ناپاک ارادوں سے محفوظ رکھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دشمن اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ وہ دھول چاٹیں گے اور بے نظیر سیاست کے افق پر ایک ستارے کی طرح چمکیں گی۔

ٹوٹا ہے کہاں اس کا جادو
ایک نعرہ بنا ہے اس کا لہو
ثابت ہوا دھڑکن دھڑکن پر وہ شخص حکومت کرتا تھا
لڑتا تھا وہ اپنے جیسوں سے ہم سے تو محبت کرتا تھا

www.bhutto.org

آئین کا مسئلہ ابھی تک حل طلب ہے۔ ہم کو ابھی آئینی بحران سے باہر نکلنا ہے۔ سارا ملک اور لوگ اس کے منتظر ہیں۔ اگر قائداعظم زندہ ہوتے تو وہ آئین سازی کرتے اور بھٹو زندہ ہوتے تو ہم کو بہت ساری تبدیلیاں نظر آتیں لیکن ان کو مار ڈالا گیا۔ جنرلز عوام کے لئے کچھ کرنا نہیں چاہتے وہ صرف ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ میں خونی تصادم کے خلاف ہوں کیونکہ یہ تصادم ہمارے ہی گھر تباہ کر دیتا ہے۔ یہ ایک بہت خوبصورت ملک ہے جس پر بدشکل لوگ حکومت کر رہے ہیں۔ ان بدفطرت لوگوں سے لوگوں کو بچانے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ پوری قوم بے نظیر بھٹو کی قیادت میں متحد ہو جائے۔

میں اپنی تحریر کا اختتام اس نظم سے کر رہا ہوں جو ان کے شہید والد کو بہت پسند تھی۔

دیپ جس کا محلّات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو، صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا
میں بھی خائف نہیں تختۂ دار سے
میں بھی منصور ہوں کہہ دو اغیار سے
کیوں ڈراتے ہو زنداں کی دیوار سے
ظلم کی بات کو، جہل کی رات کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

www.bhutto.org

نو پالیٹکس

ڈاکٹر کامل راجپر

بھٹو صاحب کی اپنی ایک سوچ تھی اور کوئی بھی چیز ان کو حکومت کے خلاف سچائی بیان کرنے سے خوفزدہ نہیں کر سکتی تھی۔

۱۹۶۹ء کے مارشل لاء دور میں جب سارے پاکستان کے تعلیمی اداروں کی حدود میں سیاست دانوں کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا تھا اس وقت میں لیاقت میڈیکل کالج، جام شورو کے طلباء یونین کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے یونین کی جنرل باڈی اور کالج کی تعلیمی کونسل کی طرف سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو "یوم لطیف" کے موقع پر مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جائے۔ یہ خبر اخبارات میں شائع ہو گئی کہ بھٹو صاحب لیاقت میڈیکل کالج، جام شورو میں مہمان خصوصی ہوں گے۔ اس خبر نے مارشل لاء حکام کو چوکنا کر دیا اور انہوں نے بھٹو صاحب پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا کہ وہ لیاقت میڈیکل کالج نہ جائیں۔ لیکن بھٹو صاحب نے ان حکام کو جواب دیا کہ جب تک دعوت نامہ موجود ہے وہ اس تقریب میں جائیں گے اور شرکت کریں گے۔ اس پر مارشل لاء حکام نے اپنی بندوقوں کا رخ میری اور کالج کے منتظم/پرنسپل بریگیڈیئر ایس ایچ اے گردیزی مرحوم کی طرف موڑ دیا اور مجبور کیا کہ دعوت نامہ منسوخ کر دیا جائے، لیکن ہم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پروگرام کے مطابق ۱۳ر اگست

www.bhutto.org

۱۹۶۹ء کو بھٹو صاحب جام شورو کیمپس پہنچے اور لیاقت میڈیکل کالج کے علاوہ حیدر آباد کے تمام کالجوں کے ہزاروں طلباء نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ مارشل لاء حکام نے بھٹو صاحب سے کہا کہ وہ سیاست پر بات نہ کریں اور اپنی تقریر شاہ عبداللطیف پر محدود رکھیں۔

بھٹوصاحب کاتقریر کی ابتداء کرنے کا اپنا ہی انداز تھا۔ انہوں نے اجتماع کو بتایا کہ انہیں سیاست پر بولنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور پھر کہا "میں ایک سیاسی جانور ہوں۔ سیاست میرے خون میں رچی ہوئی ہے۔ وہ مجھے کس طرح سیاست پر بولنے سے روک سکتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف اگر زندہ ہوتے تو وہ بھی "ایک وحدت" (ONE UNIT) کی مخالفت کرتے اور مارشل لاء حکام ان کو بھی سلاخوں کے پیچھے (جیل) بھیج دیتے۔"

اس انداز سے انہوں نے اپنی تقریر کی ابتداء کی۔ وہ استعارات کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی مزاح کی حس اکثران کے انداز تخاطب پر ایک خوشگوار اثر ڈالتی تھی۔ کوئی چیز بھٹو صاحب کو خوفزدہ نہ کر سکی اور انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا فلسفہ بیان کرنے کے ساتھ ہی حکومت کے خلاف بڑی سخت تقریر کی۔

وہ ایک تاریخی تقریب تھی۔ وہ واحد سیاسی تقریب تھی جو سارے پاکستان میں تعلیمی اداروں میں پابندی کے دوران منعقد ہوئی۔ بھٹو صاحب نے بڑی جرأت مندی سے بڑے بڑے فیصلے کئے اور کبھی انتہاء پسندوں اور فرقہ پرستوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔

۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات کے دوران انہوں نے بڑی دلیری سے عوام کو اپنے اعتماد میں لیااور کھل کر اس غنڈہ گردی اور حیدر آباد میں بے قصور سندھیوں کی ہلاکت کی شدید مذمت کی۔ سندھ اسمبلی میں لسانی بل منظور ہونے کے بعد انہوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر براہ راست عوام سے خطاب کیا اور مختلف مقامات پر بھی عوامی جلسوں سے خطاب کیا۔ اور سندھیوں اور اردو بولنے والوں سے علیحدہ علیحدہ اور مشترکہ طور پر گفتگو کی۔ بات چیت میں انہوں نے ذہانت سے کام لیا۔ الفاظ کے استعمال میں ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ صحت مند دلائل اور بحث کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے دونوں فریقوں کو "لسانی معاہدہ ۱۹۷۲ء" کی صورت میں سمجھوتہ کر لینے پر رضا مند کر لیا۔ اس معاہدے کے بعد ۱۹۷۷ء میں ان کی حکومت کے خلاف بغاوت ہونے تک دونوں فریقوں یعنی سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان ایک بھی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ میں نے ان کے حیدر آباد ڈویژن کے دورے کے موقع پر ان کی مختلف وفود سے ملاقات کا مشاہدہ کیا اور ان کی تقاریر کو سنا۔ اردو بولنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سندھیوں کی اس مہمان نوازی کو یاد دلایا جو انہوں نے تقسیم ہند کے وقت ان کے ساتھ کی تھی۔ وہ کبھی کبھی چیخ

www.bhutto.org

پڑتے تھے کہ اس پاگل پن اور کم ظرفی کو بند کیا جائے۔ جو دیہات سے شہروں میں روزگار کے لئے آنے والے دیہاتیوں کے ساتھ برتا جارہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اردو بولنے والوں کا یہ رویہ ان کو بالکل الگ تھلگ اور بے یارو مددگار کر دے گا۔ اپنے ان بھائیوں پر ظلم نہ کریں جنہوں نے آپ کا خیر مقدم کیا تھا۔ چھپے ہوئے ہاتھوں کے اشاروں پر کھیلنا بند کر دیں۔ سندھیوں کو مخاطب کر کے وہ ان کو ان کی مہمان نوازی اور اسلام سے محبت کی یاد دلاتے تھے اور ان انتہاپسند سندھیوں کی مذمت کرتے تھے جو صرف پی پی پی کی حکومت کے لئے مسائل پیدا کرنے کے لئے موقع سے فائدہ اٹھا رہے تھے انہوں نے ان انتہاپسند سندھیوں کی مذمت کی جو پوشیدہ ہاتھوں کے اشارے پر اس آگ کو ایندھن فراہم کر رہے تھے۔ انہوں نے رائے عامہ کو تعلیم دے کر ان کو ایک ساتھ رہنے کے لئے باہمی بقاء کے اصولوں کا احساس دلایا انہوں نے صوبے کی قدیم زبان جو تقسیم سے قبل صوبے کی سرکاری زبان تھی کے ساتھ اردو بولنے والوں کے رویئے پر افسوس کا اظہار کیا۔ اور ان کو یاد دلایا کہ کوئی شخص بھی سندھ کی زبان، ثقافت اور روایات کو ختم نہیں کر سکتا سندھیوں سے انہوں نے کہا کہ اگر وہ قومی زبان کی اہمیت کو تسلیم کر لیں تو کوئی شخص بھی ان کی صوبائی زبان کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتا ایک موقع پر وہ جذباتی ہو گئے اور کہا "میں ایک مسلمان ہوں، ایک پاکستانی ہوں لیکن میں اپنے آپ کو سندھی کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ مجھے فخر ہے کہ میں پیدائشی سندھی ہوں اور مرتے دم تک سندھی رہوں گا۔ میں سندھ کے تمام باشندوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف ہو گا چاہے وہ کوئی بھی زبان بولتا ہو۔

بھٹو صاحب ایک ذہین سیاست دان تھے۔ وہ پہلے رائے عامہ کو ہموار کرتے تھے اور پھر ان کی رائے کا اندازہ لگا کر بڑے فیصلے کرتے تھے لسانی فسادات کے موقع پر انہوں نے ایک قلیل عرصہ میں صورت حال پر قابو پالیا۔ انہوں نے "جئے سندھ" کے جی ایم سید اور مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ کے نواب مظفر کی کھل کر مذمت کی۔ وہ عوام کی اکثریت کو یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ سندھی اور اردو بولنے والوں کو ساتھ ساتھ رہنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنے شدید بحران میں کسی بھی سیاستدان کی اس قسم کی اعلیٰ قیادت دیکھنے میں نہیں آئی جو دیہی اور شہری سندھ کے دونوں طبقات کے درمیان مذاکرات کی ابتداء کر سکے۔ یہ ان کی ذہانت تھی جس کی وجہ سے ۱۹۷۲ء میں یہ تنازعہ طے پایا۔

بھٹو کی ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کامیابی

۱۹۷۰ء کے قومی اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر میں ڈاکٹروں کو ہڑتال پر اکسانے کے جرم

www.bhutto.org

میں فوجی عدالت کی طرف سے دی گئی چھ ماہ کی سزا بھگت رہا تھا۔ ہڑتال میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ڈاکٹروں کے مطالبات منوانے کے لئے کرائی تھی لیکن دراصل اس کا مقصد ایک آمر کے خلاف عوام کی جدوجہد میں اعانت کرنا تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم کے دوران اپنی ہر تقریر میں میرا ذکر کیا اور میری رہائی کا مطالبہ کیا۔ جب انتخابات ختم ہو گئے اور نتائج مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے حق میں نکلے تو بھٹو صاحب نے مجھے لاڑکانہ سے تار بھیجا جو تقریباً ڈیڑھ بجے صبح جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر اعوان نے، جیلر اور دو وارڈنوں کے ساتھ مجھے پہنچایا جب کہ اصول کے مطابق سیاسی قیدیوں کے کوٹھڑیاں شام پانچ بجے مقفل کر دی جاتی ہیں۔ اس تار کا مضمون تھا:۔

ڈاکٹر کامل راجپر ..... سنٹرل جیل سکھر

"عوام کی فتح میری طرف سے مبارک قبول کیجئے" زیڈ اے بھٹو، لاڑکانہ

ایسے مواقع پر بھٹو صاحب کبھی بھی "میری پارٹی کی فتح"، "میری کامیابی" یا "ہماری کامیابی" جیسے الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ "عوام کی فتح" کے الفاظ کو ترجیح دیتے تھے۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا
بھٹو صاحب کو خراج عقیدت

بھٹو صاحب نے پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت میں سندھ یونیورسٹی کے پرانے کیمپس کا دورہ کیا اور سندھی کا شعبہ نذر آتش کئے جانے پر شدید مذمت کی۔ واپسی پر میں نے ان سے ہاری راہنما حیدر بخش جتوئی کے گھر چلنے کی درخواست کی جو علالت کی وجہ سے اپنے گھر واقع گاڑی کھاتہ میں صاحب فراش تھے۔ وہ راضی ہو گئے اور ہم حیدر آباد جتوئی کے گھر پہنچ گئے۔ مسٹر جتوئی ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ نقاہت کے باوجود بھٹو صاحب کا خیر مقدم کرنے کے لئے اٹھنے لگے لیکن بھٹو صاحب نے ان کو منع کیا کہ وہ تکلیف نہ کریں اور بے آرام نہ ہوں۔

بھٹو صاحب ان کے قریب بیٹھ گئے اور کچھ خوش گپیوں کے بعد مسٹر جتوئی نے کہا "نوجوان! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ مجھے دیکھنے آئے ہیں۔ بلکہ تمام ہاری آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے بہت قلیل عرصے میں ان کو وڈیروں اور چوہدریوں کے شکنجے سے نجات دلائی۔ وہ کام جو میں اور قاضی فیض محمد اپنی ساری زندگی میں نہ کر سکے۔ وہ آپ نے بہت جلد کر دکھایا۔ ہمارے بال سفید ہو گئے لیکن ہم اپنا مقصد حاصل نہ کر سکے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم

www.bhutto.org

سب کو آپ پر فخر ہے۔"

ایک ایسے ہاری راہنما کی طرف سے جس نے سرکاری ملازمت چھوڑ کر اپنے آپ کو غریب ہاریوں کی فلاح اور مفاد کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ عظیم خراج عقیدت ہے۔

بھٹو۔ ون یونٹ اور جئے سندھ کا نعرہ

پارٹی کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے میں اور اس کے بعد خاص طور پر ۱۹۶۸ء اور ابتدائی ۱۹۶۹ء کے دوران سندھ اور دوسرے چھوٹے صوبوں میں "ون یونٹ" کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد "ون یونٹ" کے خلاف تھے۔ جی ایم سید نے جو ہمیشہ سے بھٹو خاندان سے حسد رکھتے تھے۔ "جئے سندھ" کا دلکش نعرہ دے کر بھٹو صاحب کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اور اس مقصد کے لئے انہوں نے نوجوان سندھی طلباء پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھٹو صاحب سے "ون یونٹ" کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کریں۔ یہ بات بھی صاف ظاہر تھی کہ "ون یونٹ" کو پنجاب کی حمایت حاصل تھی اور بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی پنجاب میں بہت مقبول تھی۔ بھٹو صاحب ایک ذہین آدمی تھے اور اس حساس مسئلے کی نزاکت سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے سندھ کی پیپلز پارٹی کو مشورہ دیا کہ وہ "جئے سندھ" کے نعرے کی مخالفت نہ کرے بلکہ پارٹی کے کارکنوں کو مشورہ دیا کہ وہ "جئے پاکستان" کے ساتھ "جئے سندھ" کا نعرہ بھی لگائیں۔

اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے باعث انہوں نے جی ایم سید اور ان کے آدمیوں کے دباؤ میں آ کر "ون یونٹ" کے خلاف بیان بازی کرنے کی بجائے پنجاب کی پی پی پی قیادت کو باور کرایا کہ "ون یونٹ" ملک کے مفاد میں نہیں ہے اور اس سے ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کی پیپلز پارٹی نے سب سے پہلے "ون یونٹ" کے خلاف قرار داد منظور کی۔ اس کے بعد دوسرے صوبوں نے بھی اس قسم کی قرار دادیں منظور کیں اور آخر کار بھٹو صاحب نے پی پی پی کی مرکزی کمیٹی سے بھی وہی قرار داد منظور کرالی جو "ون یونٹ" کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ "ون یونٹ" کے خاتمے اور صوبوں کی بحالی کے لئے ایک مضبوط حمائتی بن گئے۔ اس فیصلے نے سندھ کے لوگوں میں بھٹو صاحب کی مقبولیت کو اور بھی بڑھا دیا جو پہلے ہی مضبوطی سے ان کے پیچھے تھے اور ان کے بے مثال تدبر اور دور اندیشی کی وجہ سے ان کی عزت کرتے تھے۔ "جئے سندھ" کا نعرہ صرف جی ایم سید کی ملکیت نہیں رہا بلکہ ہر سندھی کا مقبول نعرہ بن گیا۔ جی ایم سید کے خطرناک عزائم بھٹو صاحب کی ذہانت کے آگے شکست

www.bhutto.org

کھا گئے اور جئے سندھ محاذ پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ وہ شرمندگی محسوس کرنے لگے اور وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکے جو بھٹو صاحب نے حاصل کی تھی۔

مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ پر بھٹو صاحب کا تبصرہ

لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر انتظامیہ نے مہاجر، پنجابی، پٹھان محاذ کے نام سے ایک تنظیم قائم کروائی جس کے سربراہ حیدر آباد کے نواب مظفر خان تھے۔ یہ افسوس ناک بات تھی کہ یہ تنظیم دیہی اور شہری آبادی میں نفاق پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جا رہی تھی۔ اصولاً ایسی تنظیم کو ممنوع ہونا چاہئے تھے کیونکہ یہ ایک فطری عمل ہے کہ انتہاپسندی جواب میں انتہاپسندی کو ہی جنم دیتی ہے۔ بھٹو صاحب شدت سے مہاجر پنجابی پٹھان محاذ اور نوجوان جئے سندھ محاذ جیسی تنظیموں کے خلاف تھے۔ انہوں نے سندھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ جی ایم سید کے سستے نعروں کے جال میں نہ پھنسیں۔ سندھیوں نے تو ان کی بات مان لی اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جی ایم سید کو رد کر دیا لیکن بدقسمتی سے اردو بولنے والی آبادی نے اپنے ہی طبقے کے انتہاپسند اور مذہبی راہنماؤں کی حمایت کو ترجیح دی۔ جس کے نتیجے میں حیدر آباد اور کراچی میں لسانی فسادات ہوئے۔ اور پھر سندھ اسمبلی میں لسانی بل، پیش کیا گیا۔ بھٹو ہمیشہ مہاجر، پنجابی اور پٹھانوں کے اس گٹھ جوڑ/ الحاق کو غیر فطری قرار دیتے تھے اور انہوں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک وقت آئے گا جب یہ تینوں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہوں گے اور یہ بات ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں درست ثابت ہوئی۔ وہ ہر وقت اردو بولنے والوں کے سیاسی کردار سے فکر مند رہتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ چند خفیہ ہاتھ ان کو کبھی بھی پیپلز پارٹی یا صوبے کے دوسرے لوگوں کی جدوجہد میں شریک نہیں ہونے دیں گے اور یہ طبقہ ہمیشہ اکثریت کے خلاف کبھی اسلام کے اور کبھی فرقہ واریت کے نام پر آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اور یہ بات نہ صرف صوبے بلکہ سارے پاکستان کے لئے نقصان دہ ہو گی۔ پیپلز پارٹی نے ان چند خاندانوں کی اجارہ داری توڑنے کی کوشش شروع کر دی جو ہماری اقتصادیات پر قابض تھے۔ پیپلز پارٹی چاہتی تھی کہ اقتصادیات کو پھیلا کر عوام تک لایا جائے اور عام آدمی کے لئے کچھ کیا جائے۔ لیکن ان خاندانوں نے انتظامیہ اور دوسرے اداروں کی مدد سے بھارت سے آئے ہوئے مہاجرین کو پیپلز پارٹی اور عوام کی جدوجہد کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

www.bhutto.org

بھٹو تقدیر پر ایمان رکھتے تھے

حاجی نجم الدین ساریوال نے جنہوں نے ۱۹۷۰ء میں بھٹو صاحب کے خلاف انتخاب لڑا تھا۔ پی پی پی میں شمولیت کا فیصلہ کیا اور بھٹو صاحب کو حیدر آباد میں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ حیدر آباد میں سرکاری دورے پر پروگرام کے مطابق بھٹو صاحب کو حیدر آباد میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے فوراً بعد ساریوال کی رہائش گاہ پر دعوت میں شرکت کرنا تھی۔ جلسے کے دوران کسی نے بھٹو صاحب کے ملٹری سیکرٹری کو اطلاع دی کہ بھٹو صاحب کی دعوت کا کھانا ایک بنگالی باورچی نے تیار کیا ہے اور شک ہے کہ اس میں (سقوط ڈھاکہ کی کشیدگی کی وجہ سے) زہر ملا دیا گیا ہے۔ ہمیشہ کی طرح میں ان کے حیدر آباد ڈویژن پر ان کو کھلایا جانے والا کھانا چکھتا تھا۔ یہ جان کر ملٹری سیکرٹری نے مجھ سے سرگوشی میں کہا کہ کھانے کی تصدیق اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ ممتاز علی بھٹو جو جرمنی گئے ہوئے تھے اسی وقت واپس پہنچے تھے۔ گفت و شنید کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ بھٹو صاحب کو مسٹر ساریوال کے گھر براہ راست لے جانے کے بجائے پہلے سرکٹ ہاؤس لے جایا جائے اور ان کی رائے معلوم کی جائے۔ چنانچہ ملٹری سیکرٹری نے پائلٹ گاڑی کو ہدایت کی کہ گاڑیوں کے قافلے کو ساریوال ہاؤس لے جانے سے پہلے سرکٹ ہاؤس لے جایا جائے۔ جب بھٹو صاحب کی گاڑی سرکٹ ہاؤس کے سائبان میں رکی تو وہ گاڑی سے باہر نکل آئے اور دریافت کیا "مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ مجھے تو ساریوال ہاؤس جانا تھا" اس وقت ممتاز علی بھٹو، جام صادق علی، آئی جی پولیس چوہدری فضل حق ملٹری سیکریٹری اور میں ان کے قریب کھڑے تھے۔ ممتاز بھٹو نے بھٹو صاحب سے ایک طرف آنے کی درخواست کی کہ وہ ان سے کچھ خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب کو ساری کہانی بتائی گئی تو انہوں نے دریافت کیا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ممتاز بھٹو اور جام صادق علی کا مشورہ تھا کہ "سائیں جی" کے ہوٹل سے کھانا لے کر مسٹر ساریوال کے گھر پہنچا دیا جائے اور وہی مہمانوں کو پیش کیا جائے۔ لیکن ملٹری سیکرٹری کی تجویز تھی کہ بھٹو صاحب صرف "سوپ" استعمال کریں اور دوسری اشیاء سے پہلو تہی کریں۔ ملٹری سیکرٹری کی اس احمقانہ تجویز پر بھٹو صاحب مسکرا دیئے اور کہا "اگر باورچی نے کچھ گڑ بڑ کرنی ہی ہے تو وہ سوپ میں بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں وہی سوپ استعمال کروں۔" یہ احمقانہ مشورے سننے کے بعد بھٹو صاحب ممتاز علی بھٹو اور جام صادق علی سے مخاطب ہوئے "کیا آپ میزبان کی بے عزتی کرنا چاہتے ہیں جس نے مجھے مدعو کیا ہے۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے آپ باورچی پر کیوں شک کر رہے ہیں۔ آپ نے میرا وقت ضائع کر دیا ہے۔ کیونکہ کھانے کے بعد مجھے مسز واسن کی چائے کی دعوت پر پہنچنا تھا۔"

www.bhutto.org

اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے راجپر تم کھانے ناپسند کرنے کے بہت شوقین ہو۔ جیسا کہ تم نے گزشتہ مرتبہ ٹنڈو محمد خاں میں میرا عجاز علی تالپور کے گھر پر کیا تھا۔ مہربانی کر کے یہاں ایسا نہ کرنا وہ تمام کھانے کھانا جو ساریوال کے گھر میں پیش کئے جائیں۔ اور جو کچھ بھی میز پر موجود ہو۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں ہر چیز کھاؤں گا۔ "

اس کے بعد وہ ساریوال ہاؤس روانہ ہو گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میز پر نو سے گیارہ افراد تک کھانا کھا رہے تھے ان میں میں بھی شامل تھا۔ میں نے دیکھا کہ ممتاز بھٹو اور جام صادق کچھ گھبرائے ہوئے تھے اور کئی اشیاء کھانے سے گریز کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب میری طرف دیکھ کر ان دونوں کی گھبراہٹ کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ خود بھٹو صاحب نے ہر چیز خوب مزا لے کر اور سیر ہو کر کھائی۔ میں نے پہلی بار ان کو اتنا زیادہ کھاتے دیکھا تھا۔

مخالفین کے ساتھ سلوک

بھٹو صاحب ملک کے مختلف حصوں میں اپنے دورے کے موقع پر کھلی کچہری لگایا کرتے تھے۔ اس موقع پر چبوترے کے دائیں اور بائیں جانب سرکاری اہلکار اور عوامی نمائندے بیٹھتے تھے اور عوام ان کے بالکل سامنے بیٹھتے تھے۔ سرکٹ ہاؤس حیدر آباد میں ایک ایسی ہی کچہری کے دوران ایک نوجوان کھڑا ہو گیا اور اپنا تعارف کرایا کہ وہ قانون کا گریجوایٹ ہے اور ملازمت چاہتا ہے۔ بھٹو صاحب کی یادداشت بہت تیز تھی اور وہ چہرے تک یاد رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے چبوترے پر اپنے قریب بلایا اور میرے کان میں کہا " راجپر! کیا یہ وہی لڑکا ہادی بخش بلوچ نہیں۔ جو پیر پگاڑو کی " حرفیڈریشن " کا صدر ہے " میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ہادی بخش بلوچ جنرل سیکرٹری جناح لاء کالج حیدر آباد رہ چکا تھا۔ اور بھٹو صاحب کی ایوب خاں کے خلاف جدوجہد میں بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی کے خلاف اخبارات کو بیانات دیتا رہتا تھا۔ اگرچہ یہ بہت پرانی بات تھی لیکن وہ بھٹو صاحب کو اچھی طرح یاد تھا۔ انہوں نے ہادی بخش سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کی ملازمت چاہتا ہے۔ ہادی بخش نے جواب دیا۔ " جناب مجھے پی آئی اے یا محکمہ کسٹمز میں ملازمت دلوا دی جائے۔ " بھٹو صاحب نے اس کی درخواست پر کچھ حکم لکھا اور اس کو واپس کر دی۔ میں جولائی ۱۹۷۷ء میں لندن سے واپسی پر پی آئی اے کارگو سے اپنا سامان حاصل کرنے کے لئے قطار میں کھڑا تھا کہ سفید وردی میں ملبوس ایک نوجوان نے میرے شانے پر اپنا بازو رکھ دیا۔ میں اس کو پہچان نہیں سکا۔ تو اس نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا۔ " میں وہی ہادی بخش بلوچ ہوں جس کو بھٹو صاحب نے ملازمت دی تھی۔ "

www.bhutto.org

خاکروب کی لڑکی کا میڈیکل کالج میں داخلہ

محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں جب میں ایڈیشنل سیکرٹری محکمہ صحت کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، ایک بوڑھا شخص میرے دفتر میں آیا میرا کمرہ اس وقت لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ بوڑھے نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ کے ایم سی کا ریٹائرڈ خاکروب ہے۔ اس نے ایک درخواست کی فوٹو سٹیٹ نقل بھی پیش کی جو جناب زیڈ اے بھٹو کے نام لکھی گئی تھی۔ میں حاشیے پر لکھی ہوئی بھٹو صاحب کی تحریر سے بہت متاثر ہوا جس میں انہوں نے وزیر اعلیٰ کو لکھا تھا کہ وہ اس خاکروب کی بیٹی کے لئے ایک خصوصی نشست کا انتظام کر کے اس کو میڈیکل کالج میں داخل کرائیں۔ اس بوڑھے شخص نے مجھے بتایا کہ "میں بھٹو صاحب سے ان کی رہائش گاہ ۷۰ کلفٹن پر اپنی بیٹی کے داخلے کے سلسلہ میں ملا تھا جس نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ بھٹو صاحب نے مہربانی کرتے ہوئے اسے میڈیکل کالج میں داخل کروا دیا تھا۔ میری بیٹی نے ۱۹۸۰ء کی ابتدا میں ڈگری حاصل کر لی تھی لیکن وہ گزشتہ سات سال سے بے روزگار ہے۔ میں نے کراچی کے میئر مسٹر عبدالستار افغانی تک رسائی حاصل کی لیکن انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ دوبارہ میں ایم کیو ایم سے تعلق رکھنے والے میئر ڈاکٹر عبدالستار سے ملا لیکن انہوں نے بھی کچھ کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس سلسلے میں آپ سے ملوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ بھٹو صاحب کے دوست ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کے لئے ملازمت چاہئے کیونکہ وہ بے روزگار ہے" میں بوڑھے کی اس کہانی سے بہت متاثر ہوا اور اس سے کہا "دیکھو بھٹو شہید نے تمہاری بیٹی کو داخلہ دلایا تھا اور اب میں ان کی بیٹی کے دورِ حکومت میں تمہاری بیٹی کا تقرر بطور "خاتون میڈیکل آفیسر" کراچی کے ایک بڑے ہسپتال میں کر رہا ہوں۔" میں نے اس خاتون کا تقرر کر کے اسے کراچی کے ایک بڑے ہسپتال میں متعین کر دیا۔ اور اس طرح میں نے بھٹو صاحب کا وہ خواب پورا کر دیا جو وہ ہمیشہ مظلوم عوام کو سماج میں ان کا جائز مقام دلانے کے لئے دیکھا کرتے تھے۔

میرا خیال ہے کہ بھٹو صاحب کا ایک نیچی ذات کی لڑکی کو میڈیکل کالج میں داخل کرانے کا یہ عمل لوگوں کے لئے اور خاص طور پر مسلمانوں کے لئے ایک اشارہ تھا کہ ایک خاکروب کی آئندہ نسل بھی ایک انسانی وقار اور عزت کی زندگی بسر کر سکے گی۔

باوفا دوستوں کی قدر دانی

بھٹو صاحب ہمیشہ سے حتیٰ کہ صدر اور وزیر اعظم بننے کے بعد بھی میرے ساتھ بہت بے تکلف

www.bhutto.org

تھے۔ اگرچہ میں سرکاری آداب کا پورا خیال رکھتا تھا لیکن وہ جب حیدر آباد آتے ہوائی اڈے یا نیاد اسٹیڈیم میں مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت خاموشی توڑ کر مجھ سے کوئی بات ضرور کرتے تھے۔ خود میں نے دو مرتبہ ان سے ملنے کی خواہش کی۔ پہلی مرتبہ ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹروں کی ہڑتال کے موقع پر اور دوسری بار ۱۹۷۵ء میں جب میں اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جا رہا تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ وہ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کو جواب دیا "یہ میری عزت افزائی ہے کہ آپ نے میری خیریت دریافت کی۔ مجھے صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔ میں جہاں بھی ہوں مطمئن ہوں۔" آخر میں انہوں نے مجھ سے سوال کیا!

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" میں نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ میری منگنی ہو چکی ہے اور اسی سال شادی کر کے پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے لندن جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس پر بھٹو صاحب نے کہا "وعدہ کرو کہ تم شادی کارڈ اس وقت تک جاری نہیں کرو گے جب تک میں تاریخ نہ دوں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے تمہارے سہرا باندھ کر بہت خوشی ہوگی۔ میرے ملٹری سیکرٹری تم سے اس سلسلہ میں رابطہ رکھیں گے" میں یہ کہتے ہوئے کہ ایسا ہونا میرے لئے باعث افتخار ہو گا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا۔ تو انہوں نے میرا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا کہ "بھٹو صاحب بہت مصروف شخص ہیں نہ ان کو وقت ملے گا اور نہ تمہاری شادی ہو گی" تقریباً دو ہفتہ کے بعد جب میں سول ہسپتال حیدر آباد میں کام کر رہا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسرے سرے پر بھٹو صاحب کے ملٹری سیکرٹری تھے۔ انہوں نے مجھے بھٹو صاحب کی مجوزہ تاریخ سے مطلع کیا اور اسے قطعی کرنے کو کہا۔

وہ تاریخ ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۳ء تھی جب بھٹو صاحب میری شادی میں شرکت کے لئے پنڈی سے کراچی پہنچ گئے۔

اندھے اعتماد کا شکار

میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں دو سال کے لئے لندن روانہ ہو رہا تھا۔ میں نے پاکستان سے روانگی سے قبل ان سے ان کی رہائش گاہ ۷۰ کلفٹن پر ملاقات کی اور ان کو بتایا کہ میں دو سال تک باہر رہوں گا۔ اس دوران اگر کوئی ضرورت پڑ جائے یا ان کو کوئی خاص پیغام پہنچانا ہو تو اس کا طریقہ کار کیا ہو گا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں اپنا پیغام سعید احمد خان، چیف سکیورٹی آفیسر کو پہنچا دوں۔ مجھے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ وہی شخص ان کے خلاف مقدمہ میں وعدہ معاف گواہ بن گیا۔

www.bhutto.org

میرا خیال ہے کہ یہ بھٹو صاحب کی عظمت تھی کہ وہ ایسے لوگوں پر اعتماد کرتے تھے اور ان لوگوں کا کمینہ پن تھا جنہوں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ میں سمجھتا ہوں یہ ہی صورت حال اس وقت بھی تھی جب انہوں نے ضیاء الحق پر اعتماد کیا۔

اس ملاقات کے دوران میں نے ان کے کئی ساتھیوں مثلاً میر رسول بخش تالپور مصطفیٰ کھر اور دیگر لوگوں کے علیحدہ ہونے کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ وہ خود بھی میر رسول تالپور کی علیحدگی سے پریشان تھے اور کہتے تھے کہ "میر رسول بخش ایک نفیس اور سادہ انسان ہے۔ ان کی علیحدگی کی وجہ ان کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور ہیں جن کو میر صاحب اپنے باپ کی جگہ سمجھتے ہیں۔ میر علی احمد تالپور کو یہ حسد ہے کہ میں نے ان کے چھوٹے بھائی کو سندھ کا گورنر بنا دیا ہے۔ دراصل اپنے بھائی کی جگہ علی احمد تالپور خود گورنر بننا چاہتے تھے۔ یہ میر علی احمد تالپور کی کم ظرفی تھی کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ میں رسول بخش تالپور کا بے حد احترام کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے اور واپس آ جائیں گے۔"

جب میں نے مصطفیٰ کھر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا "راجپر! میرا خیال ہے کہ ہمارے خلاف کوئی سازش شروع کر دی گئی ہے کوئی خفیہ ہاتھ ہمارے ساتھیوں پر کام کر رہے ہیں۔ اور آپ کو کوئی تعجب نہ ہو گا جب تم کئی غلام مصطفیٰ کھروں اور اے کے بروہوں کو انتظامیہ کے ساتھ پاؤ گے حتیٰ کے سندھ میں بھی روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ، کسانوں کے بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر اور بڑے افسر بنانے کے لئے کالجوں کا قیام، جاگیرداروں، چوہدریوں اور وڈیروں کو پسند نہیں ہے۔ میں امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو کم کرنے اور اقتصادیات کو عوامی حلقے میں وسعت دینے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ طاقتیں مجھے نہیں بخشیں گی کیونکہ کسانوں کے بیٹے ڈاکٹر بن کر ان میڈیکل کالجوں سے نکل گئے تو وہ ان وڈیروں، چوہدریوں اور جاگیرداروں کے اعصاب پر سوار ہو جائیں گے۔ میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی حتی الوسع کوشش کر رہا ہوں کہ پاکستان کے لوگوں کو ترقی کی راہ دکھا سکوں۔ یہ میری کوشش ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ پیر اور میر، سرمایہ دار اور سیاسی بونے مجھے ہرگز معاف نہیں کریں گے۔ وہ ہمیشہ ان خفیہ ہاتھوں سے مدد حاصل کر کے میرے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف برسرپیکار رہیں گے۔"

یہ میری شہید بھٹو سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں ان سے ذاتی طور پر دوبارہ نہ مل سکا۔ میں ہمیشہ مختلف مسائل پر انکی بے تکلفانہ گفتگو اور تبادلہ خیال کو یاد کرتا ہوں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ واحد شخص تھے جنہوں نے پاکستانی عوام کی زبوں حالی کے مرض کی

www.bhutto.org

تشخیص اور اس کے علاج اور حل پیش کئے اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

مجھے یقین ہے کہ شہید کی بہادر بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو ان ہی خطوط پر اس مشن کو کامیابی تک جاری رکھیں گی۔

www.bhutto.org

"میرے پاکستانی"

سعید ہمایوں ایڈووکیٹ

وہ دن شائد ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء کا تھا۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ نئے سال کی رات منانے ہوٹل میٹروپول گیا تھا اس وقت میں اسلامیہ کالج کا ایک طالب علم تھا۔ بھٹو شہید اس وقت وزیر صنعت اور تجارت تھے ان کی باکمال شخصیت کی وجہ سے ہم نے ان کو دیکھا تو ہم سب ان کے قریب پہنچ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ سندھ مسلم لاء کالج میں قانون پڑھاتے رہے ہیں، میں نے ان سے پہلا سوال جو کیا وہ تھا "جناب آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ آپ قانون پڑھاتے رہے ہیں۔ آپ مارشل لاء حکومت میں وزیر کیسے بن گئے۔ ؟"

انہوں نے جواب دیا "میں نے اسکندر مرزا کی حکومت میں شرکت کی تھی۔ مارشل لاء والوں کو میری ضرورت تھی اور انہوں نے میری خدمات حاصل کر لیں۔

کیا یہ آپ کے لئے بہتر نہیں ہے کہ فوجی حکومت میں ایک غیر فوجی وزیر بھی موجود ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک غیر فوجی کی حکومت میں موجودگی سے مارشل لاء کے اثرات کم ہوں گے بڑھیں گے نہیں۔"

میں نے کہا "جناب! آپ کے والد نے سندھ میں انتخابات کے موقع پر پیپلز پارٹی بنائی تھی حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک

www.bhutto.org

سیاسی پارٹی بنائی اور سیاسی عمل کو مضبوط کیا۔"

انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے یہ پس منظر کس طرح معلوم ہوا؟

میں نے ان کو اپنے مرحوم نانا مرزا حمیدالدین وقار کا حوالہ دیا جو ریاست جوناگڑھ سے منسلک تھے اور سر شاہ نواز بھٹو میرے نانا کا بڑا احترام کرتے تھے۔

شہید نے مجھ سے برجستہ سوال کیا "آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا موجودہ صورت حال میں ایک سیاسی پارٹی بنانا بہتر ہو گا۔ یا اس کے اندر ہی رہ کر اس کو ختم کیا جانا۔ میرے خیال میں بہتر یہ ہو گا کہ پہلے مارشل لاء ختم ہو اس کے بعد ہم سیاسی پارٹی بنا سکتے ہیں" اور پھر بات وہیں ختم ہو گئی۔

ہماری دوسری ملاقات اسلامیہ کالج کے بانی مسٹر اے ایم قریشی کے مکان پر ہوئی۔ اس وقت تک میری شادی ہو چکی تھی اور کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ اور اس وقت میں اسلامیہ کالج کی طلباء یونین کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اسلامیہ آرٹ، سائنس اور لاء کالجوں نے مشترکہ طور پر کالج کے بانی کی رہائش گاہ پر ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔

اس استقبالہ میں بھٹو شہید جو ایندھن اور توانائی کے وزیر تھے۔ محمد علی بوگرہ وزیر خارجہ اور ان کی اہلیہ نے بھی شرکت کی تھی۔ شہید کا تعلق اگرچہ ایک مختلف وزارت سے تھا لیکن انہوں نے پریس کانفرنس میں کشمیر پر بیان دیا تھا جو بہت سراہا گیا۔ جس وقت میں شہید سے ان کے بیان پر تبادلہ خیال کر رہا تھا محمد علی بوگرہ وہاں پہنچے۔ شہید نے کہا "میرے جس بیان پر آپ اتنا خوش ہیں اس نے مسٹر بوگرہ کو چپقلش میں ڈال دیا ہے۔ اور انہوں نے اس کو ان کی وزارت میں مداخلت قرار دیا ہے۔"

میں نے جواب دیا "میں آپ کی حمایت کرتا ہوں۔ کشمیر کا تعلق ہر پاکستانی سے ہے یہ وزارت خارجہ کے کسی سیکشن آفیسر کی ترقی کا معاملہ نہیں جس کا تعلق خالصتاً متعلقہ وزیر سے ہو۔"

پارٹی ختم ہونے پر طلباء نے مسٹر بھٹو نے درخواست کی وہ کسی دن کالج آ کر ان سے خطاب کریں۔

کچھ ماہ بعد مسٹر بوگرہ وفات پا گئے اور شہید کو وزیر خارجہ بنا دیا گیا اور مرحوم اے ایم قریشی نے ۷۰ کلفٹن پر ان سے ہماری ملاقات کرانے کا انتظام کیا لیکن مسٹر بھٹو کی مصروفیت کی وجہ سے اس دن ملاقات نہ ہو سکی لیکن ہم اس دن چھاؤنی کے ریلوے اسٹیشن پر ان سے مل لئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی دن ہمارے کالج آئیں گے اور طلباء سے خطاب کریں گے۔ میں نے تجویز کیا کہ ہم چین اور امریکہ کے سفیروں کو بھی مدعو کریں گے۔ مرحوم مسٹر قریشی نے ہمیں مشورہ دیا

www.bhutto.org

کہ ہم ہفتہ دس دن انتظار کریں اور پھر مسٹر قریشی کی کوشش کے نتیجے میں مسٹر بھٹو کے اسلامیہ کالج کے استقبالیہ میں روس، چین اور امریکہ کے سفیروں نے بھی شرکت کی۔

اس وقت ایک اور مسئلہ آن پڑا اور وہ تھی میری اسٹیج پر بیٹھنے کی ناپختہ خواہش۔ وہاں مسٹر قریشی پرنسپل اسلامیہ کالج اور مسٹر جسٹس اے بی میمن پرنسپل اسلامیہ لاء کالج بھی موجود تھے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ خود مسٹر بھٹو نے کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک کالج کی یونین کا نمائندہ اسٹیج پر بیٹھتا ہے تو پھر تمام کالجوں کی یونینوں کے نمائندے بھی بیٹھیں گے انہوں نے مجھے پرنسپل کے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں یہ چاہوں گا کہ غیر ملکی سفیر یہ رائے قائم نہ کریں کہ ہماری نئی نسل مہمانداری کے آداب نہیں جانتی۔ بہتر ہو گا کہ وہ یہاں سے یہ تاثر لے کر جائیں کہ ہم نے ان کی بہترین مہمان نوازی کی۔

تقریب کے اختتام پر شہید نے مسٹر اے ایم قریشی سے کہا کہ وہ کسی وقت سعید کو ان کے پاس لے کر آئیں۔ اس کے بعد میری ان سے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ملاقات ہوئی۔ شاید ہی کوئی ایسا پاکستانی ہو جس نے ان کی اقوام متحدہ میں کی جانے والی تقریر دو تین بار نہ سنی ہو۔ وہ ہر پاکستانی کی آواز تھی۔ ہر پاکستانی بھٹو سے دلی محبت کرتا تھا۔

۱۹۶۷ء میں انہوں نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت میں کے ڈی اے کے ملازمین کی یونین کا جنرل سیکرٹری بن چکا تھا۔ اپنی یونین کے چند ساتھیوں کو لے کر میں بھٹو صاحب سے ملاقات کے لئے ۷۰ کلفٹن گیا۔ وہ ہزاروں لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے میں اپنا راستہ بنا کر اندر پہنچا۔ وہ فوراً مجھے پہچان گئے "کیا حال ہے سعید! لوگ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں" انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"جناب! تمام ملک ہماری حمایت میں ہے" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے! کوئی سیاسی کام کرنے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"جناب ہم تیار ہیں"

اور اس طرح سیاسی کارروائی شروع ہو گئی۔ لیاقت آباد کے ہزاروں لوگوں نے اپنے طور پر ان کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں لیاقت آباد میں ایک سیاسی کارکن مسٹر بیگ تھے اور مجھے یاد ہے وہ پہلے شخص تھے جن سے لیاقت آباد میں مسٹر بھٹو نے ملاقات کی۔

۱۹۷۰ء میں کراچی کے کیپٹل سینما میں ایک فلم دیکھنے گیا۔ اس فلم کا نام شاید "نائٹ آف دی جنرلز" تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مسٹر بھٹو، بیگم نصرت بھٹو اور مس صنم بھٹو بھی وہی فلم دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ ان دنوں جماعت اسلامی کا ہفت روزہ رسالہ "زندگی" شہید بھٹو پر بڑی

www.bhutto.org

تنقید کر رہا تھا۔ اپنی حالیہ اشاعت میں انہوں نے شہید کے خلاف ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اتفاق سے اس شمارے میں میرے خلاف بھی مضمون لکھا گیا تھا۔

"کیا آپ نے "زندگی" کا حالیہ شمارہ دیکھا ہے" میں نے انسے پوچھا۔

"زندگی چلتی رہتی ہے" اور بات کو ہنس کر ٹال دیا۔

"اس شمارے میں میرے خلاف بھی ایک مضمون ہے" میں نے ان کو مطلع کیا۔

"مبارک ہو! اس سے ہماری طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب ہمارے کارکن بھی نشانہ بنائے جائیں تو ہماری کامیابی یقینی ہے۔"

۱۹۷۴ء میں جب وہ وزیر اعظم تھے۔ میں نے ان سے ۷۰ کلفٹن پر ملنے کی کوشش کی۔ ان کے لئے بڑے حفاظتی انتظامات کئے ہوئے تھے۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ ہزاروں پارٹی کے کارکنوں کو ان سے ملے بغیر واپس آنا پڑا۔ میں نے ان کو اس واقعہ کے بارے میں دو خطوط لکھے۔ ایک انگریزی جو پنڈی بھیجا گیا اور دوسرا اردو میں ۷۰ کلفٹن کے پتہ پر، بھٹو صاحب نے پنڈی سے جواب دیا۔ جو ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے صرف دو جملے تھے۔ "پروٹوکال کی پابندی کیا کریں۔ اردو کو ترجیح دیں" ان کا اپنی تحریر میں لکھا ہوا وہ قیمتی خط ۱۹۸۹ میں ضائع ہو گیا۔ جب ایم کیو ایم کے غنڈوں نے میرے عزیز آباد والے مکان کو آگ لگا دی۔ اس کے علاوہ چند خاص کتابیں اور پارٹی کے پرچم بھی جل گئے۔ مجھے اس وقت کافی تسلی ہوئی جب اس واقعہ پر بیگم نصرت بھٹو نے مجھے ہمدردی کا خط لکھا۔

۱۹۷۷ء میں عوامی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ میں ۷۰ کلفٹن گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ضیاء ملک میں عام انتخابات کرائے گا۔ مسٹر بھٹو نچلی منزل پر ایک بڑی کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ گفتگو کے دوران ایک شخص نے جو شاید ایک گیراج کا مالک تھا اور اس کا نام رضوی تھا مسٹر بھٹو کو بتایا کہ وہ علم نجوم اور علم جفر کا خاصا علم رکھتا ہے اور اس کے حساب کے مطابق مسٹر بھٹو کی جان کو شدید خطرہ تھا۔ اس نے مسٹر بھٹو سے درخواست کی کہ وہ اس سال اکتوبر سے قبل ملک چھوڑ جائیں۔

مسٹر بھٹو نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "میں اپنے خدا پر پورا ایمان رکھتا ہوں۔ وہ جو چاہے گا ہو کر رہے گا۔ آپ نے جو مشورہ دیا وہی چند دوسرے دوستوں نے بھی دیا ہے گو ہم نجوم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لیکن میں پاکستان کے عوام کو مارشل لاء کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتا۔"

جب وہ ہمدرد نجومی چلا گیا تو انہوں نے اپنا رخ میری طرف کیا اور سوال کیا "تمہارا کیا

www.bhutto.org

خیال ہے! کیا ضیاء انتخابات کرائے گا۔ "

"نہیں جناب! وہ جانتا ہے کہ پی پی پی بڑی آسانی سے جیت جائے گی" میں نے جواب دیا

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ انتخابات کا کوئی امکان نہیں ہے۔
تمہارے کیا منصوبے ہیں" انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"ہم کل بھی آپ کے ساتھ تھے. آج بھی آپ کے ساتھ ہیں اور کل بھی آپ کے ساتھ ہوں گے" میں نے جواب دیا۔

ایک سال گزر گیا۔ میں ایک شادی میں شرکت کے سلسلے میں لاہور میں تھا صبح تقریباً پونے نو بجے میں اپنی ہمشیرہ کے گھر جارہا تھا۔ تو میں نے ایک ٹویوٹا جیپ آتے دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ ان کو جیل سے ہائی کورٹ لے جارہے تھے یہ میری ان سے آخری ملاقات ہوئی تھی کیونکہ عین اس وقت جیپ کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اور اسے رکنا پڑ گیا۔ وہ گاڑی سے باہر آ گئے۔ میں ان کے قریب گیا اور ان کو سلام کیا۔

"ارے سعید تم یہاں لاہور میں کیا کر رہے ہو" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"میں یہاں اپنے کزن کی شادی میں شرکت کے لئے آیا ہوا ہوں۔" میں نے ان کو بتایا۔

تمام ٹریفک رک گیا اور لوگوں نے وہاں جمع ہونا شروع کر دیا۔ چند ہی منٹ میں وہاں سینکڑوں کی تعداد جمع ہو گئی اور "جئے بھٹو" کے نعرے لگنے لگے۔ لوگوں میں ان تک پہنچنے کے لئے دھکم پیل ہونے لگی اور وہ پولیس کا حلقہ توڑ کر ان تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنے قائد کے قریب پہنچ جائے۔ پولیس نے لوگوں کو پیچھے دھکیلنا اور مارنا شروع کر دیا۔

"آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ یہ عوام ہیں۔ یہ پاکستانی ہیں" انہوں نے پولیس کی سرزنش کرتے ہوئے کہا، فوراً ہی وہ ایک کھلی جیپ لے آئے۔ وہ اس جیپ میں بیٹھے اور چلے گئے۔ اس دن میں نے ان کو آخری بار دیکھا تھا۔ لیکن میری طرح اور بھی لاکھوں کے لئے وہ زندہ ہیں۔ کیونکہ ہم اب بھی وہ آواز زور سے اور واضح طور پر سنتے ہیں۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں ـــــ یہ عوام ہیں ـــــ یہ پاکستانی ہیں۔"

www.bhutto.org

ایک نمونہ کار کی نظر میں

کرٹ ہل فرام

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میری ان سے پہلی ملاقات ۵۵ - ۱۹۵۴ء میں ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک بیمہ کار دوست کے ساتھ ان کے گھر نزد کلفٹن برج گیا تھا اور ان کے افراد خاندان سے ملاقات کی تھی جو حال ہی میں بمبئی (بھارت) سے پہنچے تھے سر شاہ نواز بھٹو نے اپنے لطف وکرم سے ہم کو مدعو کیا تھا اور اپنے بیٹے ذوالفقار سے ہمارا تعارف کرایا۔ ذوالفقار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ایک دفتر میں وکالت شروع کی ہے۔ (کیمبل اسٹریٹ مقابل سندھ مدرسہ) اور اس میں مسٹر دوراب پٹیل (سابقہ جج) ان کے شریک ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے دفتر کے لئے فرنیچر کی فراہمی میں مدد کرنے کو کہا۔

بعد میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے والد نے ۷۰ کلفٹن پر ایک قطعہ اراضی حاصل کیا ہے۔ اور ایک سورئس ڈیزائنر مسٹر کوٹ زیان کو مکان کا نمونہ تیار کرنے کو کہا ہے۔ اسی دوران ان کی شادی نصرت سے ہو گئی جن کے والد ایک ایرانی تاجر تھے۔ ان کی دو بہنیں تھیں۔ ایک بمبئی میں رہائش پذیر تھیں اور دوسری ایران میں ڈاکٹر تھیں۔ ۷۰ کلفٹن کے مکان کی آرائش کے سلسلے میں میری مسٹر بھٹو کے افراد خاندان سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے کئی بار سر شاہ نواز کے ساتھ ناشتے میں شرکت کی اور وہ اکثر مجھ سے ذوالفقار کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ کہ میں ان کے بیٹے اور اپنے دوست کو سمجھاؤں کہ وہ اپنی سماجی مصروفیات میں اعتدال سے کام لے۔ مسٹر بھٹو کو نوادرات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا خاص طور پر نایاب ایرانی قالین، مغل اور ایرانی تصاویر اور دھات کی اشیاء میں ان اشیاء کے مجموعے کو بڑھانے میں ان کا مددگار تھا۔ ذوالفقار کے پاس سندھ پر لکھی گئی نایاب کتابیں اور قرآن پاک کے کئی قلمی نسخے موجود تھے۔

www.bhutto.org

ان کی سیاسی زندگی اور پی پی پی کی تخلیق کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں ہے بہرحال جب وہ ایوب خان کی حکومت میں پاکستان کے وزیر خارجہ بنے تو وہ اکثر ہمارے شورومز (وکٹوریہ فرنیچر مارٹ) شام کے وقت آ جاتے تھے اور میرے ساتھ کافی میں شرکت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان کے لئے گھر کی بنی ہوئی جھینگے کی چٹنی کی چند بوتلیں بھیجیں جو ان کو اور ان کی بیگم کو بہت پسند تھی۔ یہ چٹنی ان کو بہت پسند آئی بعد میں شاہ ایران اور ابوظہبی کے فرمانروا کی آمد کے موقع پر "المرتضیٰ" لاڑکانہ کی عمارت میں اضافہ کیا گیا جہاں ان مہمانوں کو قیام کرنا تھا۔ مسٹر بھٹو نے مکان کی آرائش میں بہت دلچسپی لی اور ذاتی طور پر میرے ساتھ اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کیا۔

ان کی اچھی عادات اور حسن مزاح کی حسیں یادیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کرے اور ان کی روح کو سکون حاصل ہو۔ آمین!

www.bhutto.org

نیکی کا پھل

منشی محمد حسین بھٹو

میں عزیز اللہ بھٹو کا بیٹا ہوں جو شہید بابا کے مزارع تھے۔ ۱۹۵۹ء میں بھٹو صاحب نے اپنے مختار حاجی یار محمد کے ذریعہ مجھے بلوایا اور مجھے تعلقہ جیکب آباد کے گاؤں شرب آباد میں منشی مقرر کر دیا۔ اور میں نے ۱۴ سال تک اسی مقام پر منشی کے طور پر ان کی خدمت کی۔

ایک مرتبہ ربیع کے موسم میں بہت بارش ہو گئی اور گندم کی زیادہ تر فصل کو نقصان پہنچا۔ جب میں حساب کتاب لے کر ان کے پاس "المرتضیٰ" لاڑکانہ پہنچا تو انہوں نے نقصان کی وجہ دریافت کی، میں نے ان کو بارش کے متعلق بتایا اور یہ کہ آس پاس کے تمام زمینداروں کی فصل مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھیں۔ لیکن ہم تھوڑی سی بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیونکہ اس نے غریبوں کی مدد کی تھی اس لئے خدا نے اس کی تھوڑی سی فصل بچالی۔ اس کے بعد انہوں نے ان زمینداروں کے نام معلوم کئے جن کی فصل مکمل طور پر تباہ ہو گئی تھی۔ میں نے تین زمینداروں کے نام بتا دیئے جو اس وقت نوڈیرو میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب نوڈیرو پہنچے اور ان تینوں زمینداروں کو طلب کیا۔ انہوں نے ڈپٹی کمشنر کو فون کیا کہ وہ ان زمینداروں کے نقصان کا ازالہ کریں۔

www.bhutto.org

زمین تقسیم کر دی

الن نریجو

۱۹۷۲ء میں بھٹو صاحب نے اپنی کچھ زمین خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاریوں میں تقسیم کر دی۔ انہوں نے نوڈیرو میں ہائی اسکول کے لئے بھی زمین عطیہ کے طور پر دی۔ بھٹو صاحب نے جیکب آباد، گڑھی خیرو، میرو خاں اور رانوڈیرو کے علاقے میں اپنی زمین خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کی اور مختار کاروں کو ہدایت کی کہ وہ ہاریوں کے ساتھ جا کر موقع پر ہی کارروائی مکمل کریں۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے ان ہاریوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جن کو زمینیں دی گئی تھیں۔ اس دوران بھٹو صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کون سی زمین ملی ہے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ میں ان کی زمنیوں کا ایک معمولی ہاری تھا اور انہوں نے مجھے ایک زمین کا بہترین قطعہ عطا کیا ہے۔ بھٹو صاحب نے فرمایا "اب تم ایک زمیندار ہو" میں ان کا شکر گزار ہوں کہ یہ سب ان کی مہربانی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے وہاں پر جمع ہونے والے لوگوں سے خطاب کیا اور اس تقریب کو جشن کے طور پر منایا گیا اور لوگ نعرے لگاتے، گاتے اور ناچتے رہے جس میں خود بھٹو صاحب بھی شریک تھے۔ اس طرح بھٹو صاحب نے اپنی ہی زمینیں بڑی خوشدلی کے ساتھ تقسیم کر دیں۔

www.bhutto.org

کھلے دروازے

عبدالواحد سومرو

۵ر اپریل ۱۹۶۲ء کو شہید بھٹو کے چچا سر نواز احمد خان بھٹو انتقال کر گئے۔ اس وقت بھٹو صاحب وفاقی وزیر تھے۔ چچا کے انتقال کے بعد جلد ہی ذوالفقار علی بھٹو کی دستار بندی کی تقریب ہوئی۔ جس میں سردار پیر بخش خاں بھٹو، نبی بخش بھٹو، ممتاز علی بھٹو، غلام علی خان اور دیگر افراد خاندان کے علاوہ پڑوس کے زمیندار اور ہندو پنچائت کے ارکان بھی شریک تھے۔ تقریب کے موقع پر سب نے اس امید کا اظہار کیا کہ بھٹو صاحب اپنے والد خان بہادر شاہ نواز بھٹو کی طرح ان کے ہمدرد اور سہارا بنیں گے۔ بھٹو صاحب نے ان کو یقیناً دلایا کہ وہ کسی بھی ضرورت کے موقع پر ہمیشہ ان کے لئے موجود ہوں گے۔ روانگی سے قبل انہوں نے حاجی یار محمد خاں کو ہدایت کی کہ جب بھی کوئی ان کے پاس مدد کے لئے آئے وہ فوراً اس کی حاجت پوری کریں "یہ تمام لوگ مجھے بہت عزیز ہیں اور میں انہیں ناامید نہیں کروں گا۔

بھٹو صاحب عید ہمیشہ نوڈیرو میں مناتے تھے۔ اور ایسے موقع پر وہ ذاتی طور پر آنے والوں کو خوش آمدید کہتے تھے اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے تھے اور اپنے ملازمین سے ان کے مسائل دریافت کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ نبی بخش بھٹو کو میرپور بھٹو بلاتے تھے اور شام کو لاڑکانہ واپس چلے جاتے تھے۔

www.bhutto.org

بروقت امداد

غلام مصطفیٰ عمرانی

۱۹۷۶ء میں شدید سیلاب کی وجہ سے دادو میں بہت نقصانات ہوئے۔ ہماری اس مشکل گھڑی میں وزیراعظم بھٹو ذاتی طور پر دادو آئے اور متاثرہ لوگوں کی دلجوئی کی اور امداد کی۔ دادو پہنچنے پر وہ پہلوان نامی ایک غریب آدمی کی دکان کی چھت پر چڑھ گئے اور بڑے ہمدردانہ اور جذباتی انداز میں ایک بڑے مجمع سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا "میرے پیارے دوستو! ناامید ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارے دین اسلام میں گناہ ہے۔ وہ مکانات جو تباہ ہو گئے ہیں دوبارہ بنائے جائیں گے۔ برے دن ہماری آزمائش ہوتے ہیں اور ایسے وقت میں خدا ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ جو کچھ بھی تباہی ہوئی ہے میں لوگوں کی امداد کے لئے حکومت کی تجوریاں کھلوانے کے لئے وہاں موجود ہوں گا۔"

لوگ شہید کے ساتھ محبت اور لگاؤ کی وجہ سے منتشر ہو گئے۔ اور وزیراعظم تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ جس پر ڈی ایس پی نے ان کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ لیکن بھٹو صاحب نے ڈی ایس پی کو ڈانٹا اور کہا "او پولیس والے! ان کو مارنے سے باز رہو۔ یہ میرے اپنے عزیز لوگ ہیں" اس کے بعد بھٹو صاحب پانی اور کیچڑ کے باوجود تباہ شدہ مکانات تک پیدل گئے۔ ایک غریب موچی صدیق نے بھٹو صاحب کو پکڑ لیا اور ان کو اپنے گھر چلنے کو کہا۔ بھٹو صاحب فوراً تیار ہو گئے اور اس کی خواہش پوری کر دی۔ شہید بھٹو عوام کے اس قدر محبوب تھے کہ ہمارے گاؤں کا ایک شخص شہید کی موت کے بعد چالیس دن تک زمین پر سویا اور دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

www.bhutto.org

ایفائے وعدہ

محمد حسن سوڈر

۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران شہید بھٹو نے ایک بیل گاڑی پر کھڑے ہو کر ضلع لاڑکانہ کے تعلقہ "وارہ" میں بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ اس کے بعد گاؤں کے ایک اسکول گئے جہاں ایک بڑا مجمع ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ وہاں انہوں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک عوام کھڑے ہیں وہ نہیں بیٹھیں گے۔

انہوں نے جذباتی انداز میں کہا "اگرچہ بھارت ایک مضبوط قوم ہے لیکن ذوالفقار علی بھٹو کے لئے اس کی طاقت کچھ نہیں ہے۔ اور بھارت ذوالفقارعلی بھٹو سے خوفزدہ ہے۔" یہ اس وقت کی بات ہے جب مسز اندرا گاندھی بھارت کی وزیراعظم تھیں۔

عوام کی محبت سے متاثر ہو کر انہوں نے کہا کہ وہ ان سے کئے گئے تمام وعدے پورے کریں گے۔

۱۹۷۳ء میں جب وہ برسراقتدار آئے تو گاؤں کے لوگوں نے ان کو اسلام آباد تار بھیجا کہ وہ ان کے مطالبات پورے کریں۔ بھٹو صاحب نے ایس پی محمد پنیال کو ہدایت کی کہ وہ عنقریب لاڑکانہ آئیں گے اور سوڈروں کو چاہئے کہ وہ وہاں ان سے ملیں۔ اپنی آمد پر بھٹو صاحب نے سوڈروں سے ملاقات کی اور آدھے گھنٹہ تک ان کی باتیں سنیں۔ انہوں نے بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنیں اور ان کے تینوں نمائندوں سے دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ان کے مطالبات یہ تھے دس اعلیٰ درجہ کی آسامیاں، ۱۰۰ ایکڑ زمین اور "وارہ" نہر میں اضافی پانی کی فراہمی۔

ہمارے تمام مطالبات پورے کر دیئے گئے اور آج بھی ہمارے گاؤں کے لوگ بھٹو صاحب کی اس مہربانی کی وجہ سے خوشحال ہیں۔ اور اُن کے وفادار داعی ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گے۔ اور ہمارے دلوں میں ان کی جگہ اور کوئی نہیں لے سکتا۔ اور ہم ہمیشہ پی پی پی کے وفادار رہیں گے۔

www.bhutto.org

قدر دانی

اختر علی گھنگرو

میں نے جنوری ۱۹۷۰ء میں سے زرعی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک ایکڑ رقبہ پر باجرے کی ایک چھوٹی نسل کاشت کرنے کا فریضہ مجھے سونپا گیا تھا۔ ۲۷ر جنوری کو شدید سردی میں اپنے جوتے اتار کر گھٹنوں تک مٹی میں کھڑا اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کام کر رہا تھا۔

بھٹو صاحب اور ان کے منیجر وہاں پہنچے اور مجھے اس طریقہ پر کام کرتے دیکھ کر کہا کہ کاش ملک کے تمام نوجوان اسی طرح آئندہ کام کریں تو ہمارے ملک کی کایا پلٹ جائے گی۔ انہوں نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے شاباش دی اور کہا "گڈ لک"

میں نومبر ۱۹۷۰ء میں ایک ریل گاڑی کے حادثے کے نتیجے میں جناح ہسپتال میں داخل تھا۔ بھٹو صاحب کے برادر نسبتی بھی وہاں داخل تھے۔ بھٹو صاحب اور بیگم صاحبہ ان سے ملنے وہاں آتے تھے۔ جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میں پہیوں والی کرسی پر اس خصوصی وارڈ جہاں وہ داخل تھے چلا گیا۔ بھٹو صاحب بہت اچھی یادداشت رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ اور ان کو فوراً یاد آ گیا کہ میں نے ایک دفعہ ان کے فارم پر کام کیا تھا۔

میں نے ان کو اپنے ساتھ گزرے ہوئے ریل گاڑی کے حادثے کے بارے میں بتایا جس پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا اور انہوں نے کرنل اشفاق کو جو وہاں کے نگران تھے ہدایت کی کہ میرے اوپر خاص توجہ دی جائے۔

مئی ۱۹۷۵ء میں بھٹو صاحب نے "المرتضیٰ" میں کھلی کچہری لگائی۔ اتنے بڑے مجمع میں جب میں ان کے فارم منیجر قیوم کی مدد سے وہاں پہنچا تو انہوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور

www.bhutto.org

جب میں نے ان سے شکایت کی کہ ریلوے والے مجھے معاوضہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔ توانہوں نے غلام مصطفیٰ جتوئی جو اس وقت ریلوے کے وزیر تھے کو ٹیلی فون کیا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ میرے معاوضے کی ادائیگی ایک ہفتہ کے اندر ہو جائے۔

مجھے آج بھی ان کی وہ سب باتیں یاد آتی ہیں۔ میں ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا تھا اور پھر پی پی پی کا ایک فعال کارکن بن گیا ۱۹۸۸ء سے میں شکار پور شہر کا پارٹی کا صدر ہوں۔ یہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ میں ان کا ایک سچا پیروکار ہوں۔

www.bhutto.org

اساتذہ کا احترام

ناٹک گریلو

کون کہہ سکتا تھا۔ کیتھیڈرل اسکول، بمبئی کا پڑھا ہوا ایک لڑکا اور پیلو مودی کا ایک دوست ذوالفقار علی بھٹو ایک دن پاکستان کا محبوب قائد بن جائے گا۔

۱۹۶۹ء میں ایک دن بڑی سخت گرمی تھی۔ گریلو اسکول کے دروازے پر ایک کار آکر رکی جس میں شہید ذوالفقار علی بھٹو اپنے چند دوستوں کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ دوست تو گرمی کی وجہ سے کار میں ہی بیٹھے رہے لیکن وہ خود ہم سے بڑے احترام اور محبت سے ملے جب ہم نے بیٹھنے کے لئے انہیں کرسی دی تو انہوں کہ کہا کہ "اساتذہ کی کرسی ہے۔ اور مجھے اس پر بیٹھنا زیب نہیں دیتا۔ اس کے بجائے وہ ایک نیم کے درخت کے نیچے ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور ان دیہاتیوں سے خطاب کیا جو وہاں جمع ہو گئے تھے ۱۹۷۰ء میں گریلو گاؤں میں ہزاروں افراد سے خطاب کرنے کے بعد پارٹی کے غریب صدر اور گریجویٹ بشیر احمد آبرو سے تمام لوگوں کی موجودگی میں وعدہ کیا کہ اگر ان کی پارٹی برسراقتدار آگئی تو وہ بشیر احمد آبرو کی خدمات کو فراموش نہیں کریں گے۔ جب پی پی پی برسراقتدار آئی تو بھٹو صاحب نے آبرو کا تقرر ڈی ایس پی کے طور پر کر دیا۔

آبرو کو جب بھٹو صاحب کی موت کی اطلاع دی گئی تو وہ بھی حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔

www.bhutto.org

۱۹۷۶ء کے سیلاب کے موقع پر جب بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا تھا۔ بھٹو صاحب لاڑکانہ آئے تو "المرتضیٰ" پر ہزاروں لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور امداد کی درخواست کی۔ بھٹو صاحب باہر آئے اور کہا "آج میں اپنی ماؤں اور بہنوں کے علاوہ کسی اور سے ملاقات نہیں کروں گا" جس پر تمام خواتین رونے لگیں اور انہوں نے اپنے نقصانات سے ان کو آگاہ کیا۔ جن کو سن کر اور دیکھ کر شہید کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے اور انہوں نے اپنے سیکرٹری کو ہدایت کی کہ نقصان کا اندازہ لگا کر ان سب کی فرداً فرداً امداد کی جائے۔

میرے ایک دوست نے جو سعودی عرب میں مقیم تھا بھٹو صاحب کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا جب وہ عمرہ کرنے مکہ گئے تھے۔ میرا دوست اس وقت وہاں موجود تھا جب خانہ کعبہ ان کے لئے خاص طور پر کھولا گیا تھا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ شہید قائد خانہ کعبہ کے اندر گئے اور باہر کھڑے لوگوں نے ان کو کچھ دیر تک روتے ہوئے سنا۔ جب وہ باہر آئے جذبات سے مغلوب تھے اور نمایاں طور پر خانہ کعبہ کی برکتوں کا اثر ان پر عیاں تھا۔

ایک دن جب بھٹو صاحب لاڑکانہ میں ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے ایک شخص ان کے قریب پہنچا اور ان پر پستول تان لیا۔ لیکن عوام نے فوراً اس کو گرفت میں لے لیا جب بھٹو صاحب کو بتایا گیا کہ اس شخص کو گرفتار کیا جا چکا ہے تو انہوں نے ہدایت کی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔

www.bhutto.org

تاریخ ساز

محمود شام

"دیکھو سائمن! میں ابھی تک قتل نہیں کیا گیا ہوں"

یہ پیرس کا ذکر ہے جہاں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بر سر اقتدار آ کر پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ ہم لوگ پہلے سرکاری دورے پر واشنگٹن جا رہے تھے۔

مسٹر لیوس سائمن پر ان کی یکایک نظر پڑ گئی۔ انہوں نے یہ بات اس کے ایک مضمون کے حوالہ سے کی تھی جو تقریباً ایک سال قبل شائع ہوا تھا اور اس میں اس نے پیش گوئی کی تھی کہ چند ماہ کے اندر مسٹر بھٹو غیر فطری موت سے دو چار ہوں گے۔ مسٹر سائمن کو دوسرے نامہ نگاروں کی طرح جن کا سی آئی اے سے رابطہ تھا۔ شائد یہ معلوم تھا کہ وہاں ایشیا کے سیاسی قائدین کے قتل کا خونی منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا۔

اس وقت تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا لیکن بہر حال وہ سچا تھا کیونکہ چند سال بعد وہ واقعہ رونما ہو گیا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو اس طرح کی پریس کانفرنسوں سے قبل خاص نامہ نگاروں سے خطاب کرتے تھے اور ان کے مضامین کا حوالہ دیا کرتے تھے جن کو انہوں نے اچھی طرح سے پڑھا ہوتا تھا۔ کبھی وہ ان کے مندرجات سے اتفاق کرتے تھے اور کبھی اختلاف۔ بطور صدر اور

www.bhutto.org

وزیراعظم وہ ذاتی طور پر وعدے کے مطابق نامہ نگاروں سے رابطہ رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی اپنے پریس سیکرٹری یا محکمہ اطلاعات عامہ کو نامہ نگاروں سے رابطہ، تعریف، توصیف یا سرزنش کے لئے استعمال نہیں کیا۔ لیکن موقع پرست اور خوشامدی لوگوں سے محکمہ اطلاعات عامہ نمٹتا تھا۔

پاکستان میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنسوں میں وہ مسٹر کے ایچ برکی سے ضرور مخاطب ہوتے تھے جو اس وقت "پاکستان ٹائمز" کے سینئر نامہ نگار تھے۔ ان کے مضامین اور کالم زیادہ تر حکومت پر تنقید پر مبنی ہوتے تھے لیکن اس کا انداز مثبت ہوتا تھا۔ مسٹر بھٹو ان کی اس بات کو پسند کرتے تھے لیکن وزیر اطلاعات اور دوسرے وزراء معترض تھے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو ایک صاف شفاف سوچ کے سیاست دان تھے وہ ایک آہنی ہاتھ والے منتظم تھے اور ایک گہری نظر رکھنے والے حکمران۔ انکا ایک تصوری خواب تھا۔ ایک پاکستانی خواب، ایک خوشحال پاکستان کا خواب، ایک مضبوط ملک کا اور ایک پائیدار اقتصادی اکائی کا۔ انہوں نے اقتصادی شعور پیدا کرنے پر زور دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ملک میں اقتصادی صحافت فروغ پائے۔ انہوں نے پرانے صحافیوں کو ملک کی اقتصادی پیچیدگیوں میں جھانکنے اور اپنی تحاریر میں اس پر رائے زنی کی ترغیب دی۔ ان کو یقین تھا کہ یہ عمل عوام میں اقتصادی مسائل کے حل کے لئے شعور پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

سابقہ حکمرانوں کے برعکس اور جو ان کے بعد آئے وہ واحد شخص تھے جنہوں نے پاکستان کی اقتصادیات کی تصویر پیش کی جس میں اس کے تاریک اور روشن پہلو اجاگر کئے گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس طرح آگے بڑھنا ہے۔ کون سی ترجیحات کو زیر غور لانا ہے اور کیا قدم اٹھانے ہیں۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک اقتصادی سوجھ بوجھ رکھنے والے کے طور پر ان کا اندازہ نہیں لگایا گیا۔ اور ان کی اقتصادی اصلاحات کا غیر جانبدارانہ آزادانہ عملی تجزیہ نہیں کیا گیا۔

تیرہ سالہ تک فوجی حکومت کی غیر متوازن اقتصادی حکمت عملی کو برداشت کرنے کے بعد صرف منافع کے خواہش مند صنعت کاروں نے اپنا سرمایہ باہر منتقل کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں ہزاروں ہنر مند بے روزگار ہو گئے اور رہن شدہ کارخانے بند ہو گئے اور SITE کراچی میں صنعتی عمل کو پھر سے شروع کرنا ایک بہت مشکل مسئلہ بن گیا۔ ایسی صورت میں بڑی صنعتوں پر سرکاری کنٹرول یا اس کو قومیا لینا واحد حل باقی رہ گیا تھا۔ قومیانے کے عمل سے ہزاروں نے اطمینان کا سانس لیا ماسوائے چند لوگوں کے جنہوں نے مختلف ردعمل کا اظہار کیا۔ ایک غیر متعصب ماہر اقتصادیات قومیانے کے عمل کا اندازہ زیادہ توجیہی طریقہ پر لگا سکتا ہے۔ اس شعبہ میں ایک لاعلم ہونے کی صورت میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس سے صنعتی شعبہ، محنت کش اور صارف

www.bhutto.org

میں اعتماد پیدا ہوا۔ پورے اقتصادی ڈھانچہ کو دوبارہ تعمیر کرنا پڑا کارکنوں میں ولولہ پیدا ہوا۔ پیشہ ورانہ انتظامیہ کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملا اور حکومت کو ٹیکس موصول ہونا شروع ہو گئے جو قبل ازیں مکمل یا جزوی طور پر خرد برد ہو جاتے تھے۔ صنعتی شعبہ میں خاندانی اجارہ داری کے بجائے پیشہ ورانہ انتظامیہ نے جگہ لے لی۔ کئی تیکنیکی ماہرین نئی مہارت اور اپنے وطن کی خدمت کا جذبہ لے کر وطن واپس آ گئے

پاکستان اسٹیل ملز کا قیام ایک خواب تھا اور وہ اس کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عظیم ابتدائی یونٹ کے افتتاح کے لئے منتخب کیا جو بعد میں آئندہ صنعتی یونٹوں کی ضرورت پوری کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس دن میں نے ان کی آنکھوں میں ایک روحانی چمک دیکھی تھی۔ اس تاریخی دن پر ان کو اس ریگستان میں یقیناً ایک عظیم کمپلکس نظر آ رہا تھا۔ اس سے ملحقہ پورٹ قاسم کا منصوبہ بھی ان کے خوابوں میں سے ایک تھا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی کراچی کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہ خواہش تھی کہ اس عظیم شہر کو ایک بین الاقوامی صنعتی اور تجارتی مرکز بنایا جائے جہاں جدید ترین مواصلاتی ذرائع ہوں۔ لہٰذا پہلی مرتبہ شہر کی سڑکوں کو چوڑا کیا گیا۔

یہ وہی تھے جنہوں نے خلیجی ریاستوں کے ساتھ پاکستانی کارکن درآمد کرنے کے معاہدے کئے اور اس طرح آئندہ کے لئے ایک مستقل زرمبادلہ حاصل کرنے کا ذریعہ پیدا کر دیا۔ یہ بات سب کو یاد ہو گی کہ چند ہی خوش قسمت پاکستانیوں کے پاس پاسپورٹ ہوتا تھا۔ اور پاسپورٹ حاصل کرنا بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہوتا تھا لیکن مسٹر بھٹو نے اس پر سے تمام پابندیاں ہٹا دیں تاکہ کارکن اپنے قسمت ساز سفر پر روانہ ہو سکیں۔ یہ حکمت عملی پاکستان کے مردہ کپڑا سازی کے کارخانوں کے کارکنوں کے لئے کویت، دوبئی، سعودی عرب اور دوسری خلیجی ریاستوں میں حصول ملازمت میں مددگار ثابت ہوئی۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف ان کے خاندانوں کی مالی حالت بہتر ہوئی بلکہ ملک کی بھی۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ انکی یہ شدید خواہش تھی کہ ہر گاؤں کے لوگ بجلی کے فوائد حاصل کریں۔ سرکاری ماہر اقتصادیات نے کہا کہ اس میں جو خرچ آئے گا وہ ملکی وسائل سے پورا نہ ہو سکے گا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو نے زور دیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو ملک کے ہر گاؤں کی گلیاں روشنی سے جگمگانی چاہئیں۔ میں مطلوبہ رقم کے حصول کے لئے سعودی عرب، کویت اور ابو دوبئی جاؤں گا، انسان کی فلاح ان کی سب سے بڑی ترجیح تھی۔ واپڈا کے سرکردہ لوگ اس بات کی تصدیق کریں

www.bhutto.org

گے کہ انہوں نے پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے دیہاتوں تک برقی لائن پہچانے میں کس شدت سے دلچسپی لی تھی۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو زرعی شعبے میں فاضل پیداوار کے حصول کے طریقوں پر بھی گفت و شنید کرتے رہتے تھے۔ کئی ترقی پسند کاشت کاروں کو یاد ہو گا کہ وہ کس شدت سے شاندار فصلوں جدید زرعی طریقہ کار اور بر آمد کے قابل پھلوں کی کاشت کے متمنی تھے۔

مجھے شہید ذوالفقار علی بھٹو کی ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے دوران سندھ اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں ساتھ جانے کا اعزاز حاصل ہے۔ اکثر مواقع پر ہم ایک ہی کار میں ہوتے تھے۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھنے کو ترجیح دیتے تھے اور اس علاقے کا امیدوار اور میں پچھلی نشست پر ہوتے تھے۔ رات کے سفر کے دوران وہ کار میں لگے ہوئے ریڈیو پر بی بی سی اور وائس آف امریکہ کو سنتے تھے اور انتخابی مہم کی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے تھے لیکن دن کے سفر میں وہ سڑک کے دونوں طرف فصلوں کو بغور دیکھتے تھے اور زرعی معاملات پر تبادلہ خیال کرتے تھے جس کا موضوع کاشت کاری، بیم دتھور، کھاد، بیج اور کاشت کاروں کا فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کا رجحان ہوتا تھا۔

یہ بدین کا ذکر ہے جب وہ ضلع نہیں بنا تھا اور بارش سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ہم لوگ انتخابی مہم کے سلسلے میں بارش سے متاثرہ لوگوں کے پاس جا رہے تھے۔ شہید بڑے غور سے موسلا دھار بارش سے تباہ ہونے والی فصلوں کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک انہوں نے ڈرائیور سے رکنے کو کہا۔ جس نے فوراً بریک لگا دیئے اور کاروں کا سارا جلوس یک دم رک گیا اور ایک عجیب منظر پیدا ہو گیا۔ ایک افراتفری مچ گئی۔ لیکن مسٹر بھٹو نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور سیدھے ایک کھیت کی طرف چلے گئے پودوں کو غور سے دیکھا اور ایک پودا اکھاڑ کر کار میں واپس آ گئے۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس پودے کی حالت کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اس کو کتنا نقصان پہنچا تھا اور آئندہ پانی کے جمع ہونے سے فصل کا نقصان روکنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔ وہ اس اکھاڑے ہوئے پودے کی نمائش اپنے عوامی جلسوں میں کرتے تھے اور وہی پودا کابینہ کے ہر اجلاس کے یا غیر ممالک میں دو طرفہ بات چیت کے دوران یا عالمی بنک اور ایشیا بنک سے قرضہ حاصل کرنے کے موقع پر ان کے ذہن میں ہوتا تھا۔ تاکہ اس مسئلہ کا حتمی حل تلاش کیا جا سکے۔

وہ ایک ایسے مدبر اور سیاست دان تھے جنہوں نے واضح طور پر ہماری اقتصادی بیماریوں کے مسائل اور اصل وجوہ کی نشاندہی کی اور ہر ایک کے دیرپا حل کے لئے طریقہ کار اور ذرائع وضع کئے۔

www.bhutto.org

اور ان پر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔

وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقام پر سامنے آئے اور پھر پوری تاریخ کو اپنے ساتھ لے گئے وہ تاریخ میں رہنے پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ نے ان کے اندر رہنے کو ترجیح دی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ فوج سے کچلا جانا پسند کریں گے لیکن تاریخ سے نہیں۔

ان کو تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہوا ہے جو ہمیشہ سنہرے الفاظ میں یاد کیا جائے گا۔